www.kitabmart.in
سقیفہ
تالیف
علامہ مجدد شیخ محمد رضا مظفر
ترجمہ
از
سید حسین مہدی الحسینی

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷-۳۷۱۸۵

قم جمہوری اسلامی ایران

ٹیلی فون نمبر ۴۱۷۴۴۷

نام کتاب : سقیفہ

تألیف : علامہ مجدد شیخ محمد رضا مظفر

ترجمہ : سید حسین مہدی الحسینی

ناشر : انصاریان پبلیکیشنز

خطاطی : سید قلبی حسین رضوی کشمیری

سال طبع : شوال سنہ ۱۴۱۶ھ ق

تعداد : ۲۰۰۰

دوسری فصل

تیسری فصل

سقیفہ ۱۰۷

چوتھی فصل

بسم اللہ ولہ الحمد

میں اپنی اس حقیر کاوش کو مظلومِ تاریخ

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام

کے

نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں۔

سید حسین مہدی الحسینی

سحرِ جمعہ ۲۰ر شعبان سنہ ۱۴۱۶ھ

۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۹۶ء

بسم اللہ ولہ الحمد

واقعۂ سقیفہ ــــ تاریخ اسلام کا عظیم سانحہ تھا، اس موضوع پر خوب خوب لکھا گیا، لیکن ہر فکر ایک نیا گوشہ لے کر سامنے آتی ہے۔

زیر نظر کتاب بھی کچھ نئے پہلوؤں کے ساتھ نجف اشرف کے عظیم محقق و مجدّد علامۂ شیخ محمد رضا مظفر کے قلم کا شاہکار ہے۔

جناب انصاریان کی فرمائش پر حقیر نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت احدیت اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام سے روز افزوں توفیقات کا خواہاں ہوں۔

سید حسین مہدی الحسینی

۲۰ شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ ق

مؤرّخ پر عقیدہ کا اثر

مؤرّخ کے لئے وقت تحریر اپنے کو قومی، مذہبی اور ملکی تعصّب سے پرے رکھنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ چونکہ ہر انسان کا ضمیر اسے ٹھوکے دیتا ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات کی تائید کرے، لہٰذا ایسی صورت میں کسی تحریر کا مؤرخ کے افکار و عقائد سے خالی ہو کر سامنے آنا تقریباً محال ہے۔

یہ بات اکثر دیکھنے میں بھی آئی ہے کہ صاحبان فکر و نظر اگر کوئی حق بات کہنا بھی چاہتے ہیں تو نہیں کہہ پاتے کیونکہ ان کا وہ ماحول جس میں ان کی پرورش ہوئی ہے۔ وہ "عقل و حقیقت" کے درمیان رکاوٹ بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے کوئی طائر خوبیٔ تقدیر سے قفس سے آزاد ہو کر پرواز کرنا چاہے تو غبار قفس اور طولانی اسارت کی وجہ سے وہ چاہتے ہوئے بھی بلند پروازیاں نہیں کر پاتا بلکہ بسا اوقات تو غیر اختیاری طور سے گر جاتا ہے۔

یہی حال اس مؤرخ کا ہے جو اپنے کو ماحول سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اگر کسی نے اظہار عقیدہ، تسکین نفس اور ماحول سے متاثر ہو کر کچھ قلم بند کیا ہے تو اس کی تحریر کو کرو دں سلام۔

میری خدا سے یہ دعا ہے کہ میں ایسا لکھنے والا نہ بنوں۔

مؤرخین کی اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اظہار عقیدہ اور ماحول سے متاثر ہو کر کتابیں لکھیں۔ اکثر بھی میں نے احتیاطاً کہا ہے ورنہ سو فیصد مؤرخین ایسے ہی تھے اور ہیں۔ اگرچہ اپنے کو اظہار حق میں غیر جانب دار ظاہر کرتے ہیں۔

لیکن ان کی جانب داری ان کے قلم سے پھوٹتی رہتی ہے اور انکے قلم سے ترتیب پائی ہوئی کتاب ہو یا تاریخ ان کے باطن کی عکاس رہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث کو منتخب کرتے ہیں جو ان کے نظریہ کی ہم آہنگ و موافق ہوتی ہے۔ اور پھر نتیجہ میں ان لکھنے والوں نے ان افراد کو جھوٹا اور جعل ساز بتایا۔ جن کی بیان کردہ روایتیں ان کے منشاء کے مطابق نہ اتریں اور اس کو سچا اور ثقہ مان لیا جس کی بیان کردہ حدیثیں ان کے مفاد کے مطابق تھیں۔

اضطراب تاریخ

اسلامی تاریخ میں خصوصیت سے کچھ ایسے شک و شبہ داخل

ہو گئے ہیں جس کا حل کرنا اہل نظر کے لئے دشوار ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں کچھ ایسے جعلی و نقلی حدیث بیان کرنے والے پیدا

ہو گئے جنھوں نے حقائق کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا۔

اس کا واضح ثبوت یہی ہے کہ اکثر تاریخی واقعے میں جزوی اختلاف کے ساتھ ساتھ اصل واقعہ میں شک و شبہہ پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حدیثوں پر اعتماد باقی نہیں رہتا۔

بعید ہے کہ کسی نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہو اور اس کو اس تلخ حقیقت کا اندازہ نہ ہوا ہو، اور ایسا بھی نہیں کہ ان ساری غلطیوں کو غفلت پر محمول کیا جا سکے۔

ہمیں تو تاریخِ وفاتِ مرسلِ اعظم صلّی اللہ علیہ وآلہ کے اختلاف ہی سے متنبہ ہونا چاہیے کہ بھول چوک نہیں بلکہ ایک سازش تھی ورنہ اصولی طور سے آنحضرتؐ کی تاریخِ وفات میں کسی طرح کا شک و شبہہ نہیں ہونا چاہیے تھا، نہ صرف یہ کہ تاریخِ وفات میں اختلاف ہے بلکہ ماہِ وفات میں بھی اختلاف ہے جبکہ آنحضرتؐ کے دائمی فراق نے سارے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اور جب وفاتِ پیغمبر اسلامؐ کا یہ حال ہے تو پھر اگر حدیثوں اقوال اور تاریخِ جنگ میں اختلاف ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں اور ان مسائل کے لئے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا جو مسلمانوں کے حالات و کیفیات سے متعلق تھے جس میں ایک دوسرے کی تکفیر

کی جا رہی تھی اور مسلمان آپس ہی میں بر سر پیکار اور ایک دوسرے کو گالم گلوج کر رہے تھے۔

اسبابِ جعل

شاید تین وجہ رہی ہو جس کی بنا پر حدیثیں گڑھی جا رہی تھیں

ا۔ اپنے عقائد و نظریات کو استحکام دینا مقصود تھا۔ لہٰذا عقیدہ سے ملتی جلتی حدیثیں گڑھی گئیں۔

ب۔ چونکہ صدر اسلام کے عوام میں محدثین کی بڑی منزلت تھی۔ لہٰذا عوام پر اپنی فوقیت و برتری کے اظہار کے لئے حدیثیں گڑھی گئیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ایسی حدیثیں پیش کی جائیں جو عوام کے پاس نہ ہوں۔

اس عظمت و منزلت نے جھوٹی و سستی شہرت کے لئے کم عقلوں کو جعلی حدیثوں پر اکسا دیا۔

ج۔ بنی امیہ اور اس کے ہوا خواہوں نے محدّثین کی دل کھول کر داد و دہش کی تاکہ اموی حکومت کی سیاہ کاریوں کی حمایت و توقیر اور کرامت آل محمدؐ علیہم السلام کی توہین و تحقیر میں حدیثیں گڑھیں۔

ان جعل سازیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے سر و پا حدیثوں کی بہتات ہو گئی اور اس نے اسلام میں بہت بڑا رخنہ پیدا کر دیا اور پیکر

اسلام پر وہ کاری ضرب لگائی کہ آج تک اس کا مداوا نہ ہو سکا۔

میرا انداز

یہی وجہ تھی کہ مجھے اس کتاب کے لکھتے وقت مورخین و محدثین کی نقل کردہ چیزوں پر بھروسہ نہ رہا اور مذہبی اعتبار سے اختلافی حدیثوں کے سلسلہ میں بھی متحیر ہو گیا۔

مجھے خود فکر ہے کہ بنام سقیفہ پیغمبر اسلام کے بعد جو واقعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اسے کیونکر حل کروں، نفس کا مطالبہ ہے کہ عقیدے کو تقویت دوں اور تاریخ میں ایسی مشکوک و مشتبہ باتیں ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں۔

واقعۂ سقیفہ پر طرفین نے کتابیں لکھی ہیں لیکن کوئی پچھم بھاگ رہا ہے تو کوئی پورب۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے عقیدہ کی گرفت سے آزاد اور تعصّب کی عینک اتار کر بلند فکری کے ساتھ اس واقعہ کا تجزیہ کروں کیونکہ حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔

واقعۂ سقیفہ مجھ پر مشتبہ ہے لہٰذا میرا فریضہ ہے کہ اس کی چھان بین کروں۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ تاریخ کی بھول بھلیوں سے کیوں کر نکلوں جس میں قدم لڑکھڑاتے رہتے ہیں۔

بہت دنوں سے یہ خواہش تھی کہ اس معمّے کو حل کروں تاکہ خود مجھ پر بھی حقیقت آشکار ہو سکے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ انشاءاللہ اپنی کوشش میں کامیاب رہوں گا۔

مجھے امید ہے کہ جس طرح اس بحث کو پیش کر کے مجھے کیف محسوس ہو رہا ہے اسی طرح دوسرے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

میری ایک کوشش یہ بھی ہے کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور واقعۂ سقیفہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا تو اندازِ تحریر بالکل روکھا سوکھا نہ رہے تاکہ قاری پر گراں نہ ہو اگرچہ اس راہ میں کچھ سختیاں اور دشواریاں ہیں لیکن عوامی افادے کے پیش نظر سب کچھ برداشت کرنے کے لیے راضی ہوں۔

میں نے اپنے طویل مدت مطالعہ میں مخالفین کی کتابوں کو ماٰخذ و مدرک قرار دیا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جذبات کا عقل پر غلبہ نہ ہو سکا اور حق سے قریب ہونے کے امکانات زیادہ پیدا ہو گئے۔ چونکہ دوسروں کے ماٰخذ و مدرک اور ہمارے عقیدے کے تضاد و اختلاف سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے اسے "درمیانی رائے" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ممکن ہے اگر کوئی قبول کرے تو یا حق کو پائے یا حق تک پہنچ جائے۔

اس کتاب میں حقیر نے اپنے قدیم تاریخی حاصل مطالعہ کو پیش کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی واقعہ یا حدیث متعدد کتابوں میں پائی جا رہی ہے تو اس کے ماٰخذ کو ذکر نہیں کیا۔ صرف انہیں حوالوں کو حاشیے پر ذکر کر دیا ہے

جو دو تین کتابوں تک محدود تھے۔

میری تمنا ہے کہ میری یہ ناچیز کوشش پڑھنے والوں کے لئے مفید ہو سکے تاکہ وہ کھلے ذہن اور ہر طرح کے جذبات و رجحانات سے بری ہو کر حق کو پہچان سکیں یا کم از کم اس سے قریب ہو سکیں۔

خدا ہی سے توفیق کا خواہاں اور نصرت کا متمنی ہوں۔

والسّلام

مؤلف

آغاز

عالم امکان پر ضوبار نور رسالت کے روپوش ہوتے ہی ۱۱ھ میں زمانے نے تاریخ کے اس صفحے کو پلٹ دیا جس پر اسلامی عظمت و منزلت، صداقت و ایمان، جہاد و قربانی، فخر و سرفرازی، عزت و مکرمت، عدالت و رحمت، اخوت و انسانیت اور فضائل و محامد کی نورانی لفظوں میں داستانیں لکھی ہوئی تھیں۔

مسلمانوں کے سامنے کتاب ہستی کا جو صفحہ سامنے آیا اس کے خطوط درہم و برہم تھے جس کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے:

"اگر محمد اپنی موت سے مر جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں اپنے کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے"[1]

جو شخص قرآن کو وحی الٰہی مانتا ہے اور عقیدہ رکھتا ہے کہ نبیؐ اپنی مرضی سے نہیں بولتا بلاشبہ اس کے لئے انسانیت کے نجات دہندہ نبی کی موت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے، اس میں اور نبیؐ کی زندگی کے زمانے میں نمایاں

---

[1] آل عمران / ۱۴۴

فرق ہے۔ زندگی میں سب ٹوٹے پڑ رہے تھے، مرنے کے بعد کوئی گور و کفن میں شریک نہیں۔

زمانۂ پیغمبر وہ تھا جس میں مسلمان بہ ہمہ جہت "الی اللہ" متوجہ تھا اور بعدِ رسولؐ اس کی طرف سے روگردانی کر لی تھی۔

اب ہمارے سامنے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پیغمبرؐ اسلام دنیا سے جا چکے ہیں حتماً مسلمانوں کو الٹے پاؤں اپنے کفر کی طرف پلٹ جانا چاہیئے۔

کیا سب پلٹ گئے؟

ابھی واضح نہیں!

لیکن کفر کی طرف پلٹنے کا سبب کیا ہوا؟

قاری گرامی! ذرا آزادی خیال کے ساتھ میرے ساتھ چلئے اور اس واقعہ کو تلاش کیجئے جو بلا فاصلہ ارتحال پیغمبر اسلامؐ کے بعد رونما ہوا جس نے سب کو متأثر کیا۔

کیا سقیفہ کے علاوہ کوئی واقعہ ملتا ہے؟

یقیناً سقیفہ تاریخ کا عظیم حادثہ ہے!

کیا آپ کے علم میں ہے کہ شیعوں نے آیت کی تفسیر اسی واقعہ سے کی ہے؟

اب ہماری کوشش ہے کہ سقیفہ کی تحقیق کریں جو بعدِ رسولِ اسلامؐ کا سب سے عظیم و پہلا حادثہ ہے اور سقیفہ کا گہرا ربط آیت سے ہے خواہ اس کی تفسیر اس واقعہ سے ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

اسی لئے میں نے مقدمۂ کتاب میں کہا تھا کہ کچھ "پچھم بھاگ رہے ہیں تو
کچھ پورب" مختلف واقعے زیب داستان بن چکے ہیں جس کی وجہ سے
واقعۂ سقیفہ طرح طرح کے رنگ و روپ میں سامنے آگیا جس نے طالب حق

کو زحمت و مشقت میں ڈال دیا ہے۔
بے جا نہیں ہوگا اگر ابھی یہ بتا تا چلوں کہ آیۂ کریمہ نے جس ارتداد کا
تذکرہ کیا ہے اس کو خلافت ابوبکر کے زمانہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔
لیکن میں اس احتمال کو تسلیم نہیں کرتا چونکہ آیت نے ارتداد کا اشارہ
پیغمبر اسلامؐ کے ارتحال کے فوراً بعد کیا ہے جس میں تمام مسلمان شریک ہیں
اور جو افراد مرتد ہو گئے، خواہ ان کی تعداد کچھ بھی رہی۔ وہ ایک مختصر سی
جماعت تھی جو مدینۂ منورہ سے دور دراز علاقوں میں پائی جارہی تھی۔
مزید برآں جنھیں مرتد کہا جارہا تھا وہ مسلیمہ اور اس کے ہوا خواہ،
طلیحہ اور اس کے طرفدار تھے جنھوں نے زمانہ آنحضرتؐ میں نبوت کا ادعا
کیا تھا، آنحضرتؐ کے بعد شدت اختیار کر لی۔
نئے ناموں میں سجاح تمیمہ ہے لیکن اس کی ذاتی کوئی حیثیت نہیں
تھی مسلیمہ کذاب کی تحریک میں ضم ہو کر رہ گیا تھا۔
اسود عنسی حیات مرسل اعظمؐ میں قتل کیا گیا اس کے طرفدار
اسی کے مسلک پر باقی ہے۔ علقمہ بن علاثہ اور ام دفل سلمی بنت مالک
بھی زمانۂ آنحضرتؐ ہی میں مرتد ہو چکے تھے۔
کیا یہ مناسب ہوگا کہ ان افراد کے لئے یہ کہا جائے بعد پیغمبر اسلامؐ

دین سے منحرف ہو گئے اور یہ لوگ آیت کے مخاطب ہیں؟ جس میں بھی فکرِ صحیح اور آزادیٔ رائے پائی جا رہی ہو گی وہ قطعاً اس کی تصدیق نہیں کرے گا کہ آیت کا خطاب ان افراد سے ہے جو حیات آنحضرتؐ میں مرتد ہو چکے تھے۔

اب رہا سوال — مالک بن نویرہ کا، کیا یہ بعد رسولؐ مرتد ہو گئے تھے؟ اس کا جواب بھی تلاش کریں۔ مالک بن نویرہ نے سجاح سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تو ضرور کیا تھا لیکن مرتد سے عہد و پیمان کر لینے سے کوئی کافر و مرتد نہیں ہو جاتا چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے کعب قرضی سے عہد و پیمان کیا تھا۔ مزید براں — مالک کا یہ معاہدہ مسلمانوں کی بھلائی کے پیش نظر تھا تاکہ مرکز اسلام مدینہ سے دور افتادہ علاقوں میں مسلمانوں سے کوئی جنگ نہ کرے۔ مالک کا مقصد پورا بھی ہوا۔

اور اگر یہ معاہدہ گناہ تھا تو مالک اور ان کے ساتھیوں نے توبہ کر لی — جس طرح وکیع و سماعہ نے سجاح سے معاہدہ کرنے کے بعد توبہ کی — مسلمانوں نے توبہ قبول بھی کیا۔

جس وقت خالد بن ولید نے مالک کو قتل کیا اسی رات ان کی بیوی سے زنا کی، ابو بکر نے مالک کی دیت (خوں بہا) ادا کی —

کیا آیۂ ارتداد کی یہ تفسیر ہے؟

مالک بن نویرہ کا اس کے علاوہ کوئی جرم و گناہ نہیں ہے کہ انہیں لشکر اسلام کے کمانڈر خالد بن ولید نے شہید کیا۔ انصاف تو یہ تھا کہ خالد بن ولید کے عمل کی مذمت کی جاتی لیکن اس کے برخلاف

مالک بن نویرہ کو مرتد ثابت کیا گیا ــــ اور اگر بزرگی کی وجہ سے خالد کی تنقید نہیں کی جاسکتی تو مالک بن نویرہ کو ناسزا و ناروا کہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

عمر بن خطاب نے ابوبکر سے مطالبہ کیا کہ خالد کو زنا کے جرم اور بے قصور مالک کی شہادت پر قتل کیا جائے لیکن ابوبکر نے یہ کہکر روک دیا کہ ــ خالد سے "خطائے اجتہادی" ہوئی ہے اور مجتہدین کی خطا قابل گرفت نہیں ہے۔

یہ ابوبکر کی من گھڑت ہے کہ انہوں نے صراحتہً قانون اسلام کی مخالفت کرنے والے کے لئے اجتہاد کو سپر بنایا۔

مالک بن نویرہ کے بھائی نے جس وقت ابوبکر کے سامنے یہ شعر پڑھا:

ادعوته بالله ثم قتلته　　لو هو دعاک بذمة لم یغدّ

خدا کی قسم تم نے انہیں بلایا اور شہید کر دیا در آنحالیکہ
وہ تم سے پناہ کا خواہاں تھا اور مجرم بھی نہیں تھا۔

ابوبکر نے جواب میں نہ یہ کہا کہ ــــ وہ مرتد ہو گئے تھے، اور نہ یہ اقرار کیا کہ میں نے بلایا اور قتل کیا ہے۔

بلاشبہہ ــــ تاریخ مالک کو بے قصور سمجھتی ہے اور عصر حاضر کے بعض مؤرخین خالد بن ولید کو مرتد و کافر لکھتے ہیں۔

کیا ان کے علاوہ بھی کچھ مرتد ہوئے تھے ؟

وہ لوگ جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔

ان کو بھی تلاش کرنا چاہئے کہ ان کے نام کیا ہیں اور کس قبیلے کے لوگ ہیں۔

آج تک کوئی صراحت سے نہ بتا سکا کہ وہ لوگ کون تھے "تاریخ بغلیں جھانک رہی ہے اور سربستہ کچھ ذکر کرکے گذر جاتی ہے۔ لیکن مدّعیان نبوت کے علاوہ کسی کا سراغ نہیں ملتا جنھوں نے زکواۃ دینے سے انکار کیا ہو۔

ابوبکر کا یہ مشہور فقرہ ـــــ

اگر ایک سال کی زکوٰۃ مجھے نہ دی تو ان سے جنگ کروں گا" ـــــ

یہ بھی اس وقت کا ہے جب مدعی نبوت طلیحہ کا وفد ابوبکر کے پاس نماز اور ترک زکوٰۃ سے متعلق معاہدے کے لئے آیا تھا۔

اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کچھ گمنام قبیلے تھے جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا تو کیا ایک واجب کے ترک کرنے والے کو کسی مذہب و دین میں مرتد کہا جاتا ہے جب کہ نماز بھی پڑھ رہا ہو۔

آپ کو اختیار ہے جو چاہیں فیصلہ کریں ـــــ اتنا طے ہے کہ ان لوگوں نے صراحتہً زکوٰۃ کے وجوب کا انکار نہیں کیا تھا جس سے ضروریاتِ دین کے انکار کے جرم میں مرتد و کافر قرار پاتے۔

اگر یہ لوگ مدعیانِ نبوت کے علاوہ تھے تو انھوں نے زکوٰۃ کے وجوب کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔

شاید نہ دینے کی وجہ یہ رہی ہو کہ ابوبکر کی خلافت کے لئے عمر بن خطاب کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے اتفاق و مشورے سے نہیں طے پائی ہے لہٰذا جن لوگوں نے زکواۃ دینے سے انکار کیا۔ شاید انکا مقصد یہ رہا ہو کہ زکواۃ اس کے سپرد کی جائے جو رسولؐ خدا کی جانب سے خلافت کے لئے معین ہوا ہو ـــــ ممکن ہے منکرین زکواۃ نے یہ دعویٰ کیا ہو، لیکن تاریخ نے کسی

ایسے دعوے کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

یہ سارے وہ احتمالات ہیں جس کو اس وقت کے حالات کے پیش نظر تسلیم کیا جا سکتا ہے تاریخ اس کی تردید و تکذیب نہیں کرتی اور خود شیعہ حضرات بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

بہر حال مانعین زکواۃ جو بھی ہوں جب تاریخ نے ان کے نام و نشان نہیں بتائے تو ہم کو بھی مزید کسی اظہار کی ضرورت نہیں۔

خلاصۂ کلام اگر ارباب قلم نے آیت کی رو سے اسلام میں رونما ہونے والے پہلے انقلاب و ارتداد کو ثابت کر دیا تو پھر بعد میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کی چنداں اہمیت نہیں۔ بلکہ پہلی ہی آیت سے بعد والے واقعات کو سہارا ملتا رہے گا۔ میں اس جگہ اپنے تئیں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ پر واضح کر دوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد درپیش اختلاف کے لئے کیا کیا۔

ا۔ آیا کسی کو جانشین بنایا؟

ب۔ کوئی قانون و قاعدہ بتایا کہ مسلمان اس سے سہارا لیں۔

ج۔ یا بالکل خاموش رہے، خود مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔
ان عناوین کا ہماری کتاب سے گہرا ربط ہے اور اکثر واقعات کی وضاحت اسی پر موقوف ہے۔

لہٰذا میں نے کتاب کو چار بابوں میں تقسیم کیا ہے :
۱۔ خلافت سے متعلق پیغمبرِ اسلام کا طریقۂ کار۔
۲۔ اختلاف کی روک تھام کے لئے پیغمبرِ اسلام کا اقدام۔
۳۔ بیعتِ سقیفہ۔
۴۔ حضرت امیر المومنینؑ کی حیثیت اور آپ کا انداز۔

پہلی فصل

خلافت سے متعلق پیغمبرِ اسلام کا طریقۂ کار

کیا آپ اپنے تئیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلافت وجانشینی سے متعلق جو اختلافات ہونے والے تھے اس سے باخبر نہیں تھے کیا آپ کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرف سے بالکل غافل تھے؟

اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو میری گذارش ہے کہ آپ میری کتاب رکھ دیں مطالعہ سے اپنے کو خستہ نہ کریں ـــ کیونکہ میری اس کتاب کا مخاطب وہ افراد ہیں جو آنحضرتؐ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ کی تاریخ زندگی سے اس قدر باخبر ہیں کہ اگر کوشش کریں تو تیئیس ۲۳ سالہ زمانۂ رسالت کے مطالعہ سے مذکورہ سوال کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

کیونکہ جو اسلامی عقیدہ رکھتا ہے اس کے لئے اتنا تو بہر حال ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار فرمایا کہ ـــ ہمارے بعد ہماری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے ایک جنتی ہوگا اور بقیہ جہنمی[1]۔

---

[1] صحیح مسلم ج ۸ ص ۱۰۷ وغیرہ

اس اختلاف سے صرف وہ محفوظ رہیں گے نعمت الہٰی جن کے

شامل حال ہوگی۔

یہ اصحاب اپنے ارتداد کی وجہ سے جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے اور جس وقت انہیں حوض کوثر پر روکا جائے گا اس وقت متوجہ ہوں گے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کے بعد کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

بعض احادیث میں ہے کہ :

"مجھے یہ محشر میں بتایا جائے گا کہ جس وقت آپ نے دنیا چھوڑی یہ اسی وقت سے مرتد و بے دین ہو گئے"۔

آنحضرتؐ نے یہ بھی خبر دی :

"میری امت ہو بہو گزشتہ قوموں کی پیروی کرے گی پہلے ایک ایک بالشت پھر ایک ایک ہاتھ ان کی طرف بڑھے گی یہاں تک کہ اگر وہ لوگ سوسمار (گوہ) کی بل میں داخل ہو جائیں تو ہماری امت اس میں بھی ان کی اتباع کرے گی"۔

آپؐ نے یہ بھی پیشنگوئی فرمادی تھی کہ خلافت تیس سال کے بعد ایک جبّار حکومت میں تبدیل ہو جائے گی۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا تھا :

"جب تک قریش کے بارہ حکمراں حکومت نہیں کر لیتے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔"

یہ بھی آپؐ ہی کا ارشاد ہے :

اس موضوع کی تحلیل و تفسیر میں آپ میرے ہمراہ رہیں کیونکہ ممکن ہے ہم تعین خلیفۂ مسلمین کے لئے جس انداز انتخاب کو اسلام کے لئے باعث فخر و شرف سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت اسلام کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہو، ایسی صورت میں ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر سربراہ حکومت کا انتخاب عوام کی رائے پر چھوڑ دیا جائے تو وہی ہرج و مرج و اختلاف و انتشار رونما ہو گا جس سے بچنا چاہ رہے تھے کیونکہ عوام کو یہ حق دیکر انہیں اختلاف کے بحر ناپیدا کنار میں ڈھکیل دینا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بظاہر ایک دوسرے سے شباہت رکھتا ہے لیکن درحقیقت اپنی عادت و انداز جذبۂ عاطفت و محبت اور ذوق و شوق کے اعتبار سے قطعاً ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ توأم پیدا ہونے والے بھی آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

یہی نہیں ہر انسان کی جسمانی ساخت اس کے اخلاق و اطوار اور نفسیات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں، ابھی تک کوئی ایسا نہیں ملا کہ اس کی انگلیوں کے خطوط دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں۔

ایسی صورت میں محال ہے کہ ایک شہر والے کسی ایک بات اور ایک انداز پر متفق و متحد ہو جائیں چہ جائیکہ اتنی بڑی ملت اسلامیہ وہ کیونکر کسی نقطہ خیال پر متفق ہو سکتی ہے، وہ بھی اس وقت جب مسئلہ ذاتی اغراض و جذبات کی لپیٹ میں ہو۔

لہذا ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ درحقیقت عوام کی رائے کا معلوم کرنا

ہر قوم کے لئے قطعاً محال ہے۔

لہٰذا عوامی رائے معلوم کرنے کا خیال بالکل بکواس ہے اور کسی قوم کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ متحد ہو کر کسی مسئلے کو طے کرے یہی نہیں کہ سب کی رائے کا معلوم کرنا محال و ناممکن ہے بلکہ شدید کشت و خون کا سبب ہوگا۔ اس وقت خون خرابہ سے بچا سکتا ہے جب مطلق العنان حکمراں اپنے طنطنے سے مخالفین کو دبا دے جیسا اس زمانے میں ترقی یافتہ قوموں کے الیکشن میں دیکھنے میں آتا ہے کیونکہ ان انتخابات کے ذریعہ اکثریت کو مسلط کرکے خوش اسلوبی کے ساتھ انتشار و اختلاف سے بچ جاتے ہیں۔

اکثریت کا مسلط کرنا خود اعتراف ہے کہ عوام کی حقیقی رائے کا معلوم کرنا ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔

اگرچہ حکمراں کا انتخاب اکثریت کی رائے سے طے ہو گیا لیکن خود اس اکثریت کو مفید و کارآمد بنانے میں حکومت کا دبدبہ اور قانون عمومی کا زور کارفرما رہا۔ حکومت کے تسلط نے یہ منوایا کہ اکثریت حکومت کرے لہٰذا جنھوں نے اس ہٹ دھرمی کو مان لیا ان کے لئے تو اکثریت آراء کا نظام قابل قبول ہے۔

اس نظام اکثریت آراء نے آرائے متوسط کے درمیان توازن پیدا کر دیا ورنہ اکثریت میں خود بھی اتفاق و اتحاد نہیں ہے۔

اور اس نظام "اکثریت آراء" سے تمسک بھی اس لئے کیا کہ جو بھی قاعدے وضابطے اس کے علاوہ بنائے وہ ناکامیوں کا شکار رہے۔ بارہا کی شکست وریخت کے بعد یہ واحد نظام تھا جسمیں قوموں کی سلامتی پائی جارہی تھی لہذا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اکثریت آراء میں خطاء و غلطی نہیں ہوتی وہ بھی اس وقت جب روز بروز انحطاط فکری پایا جارہا ہو، اور ہر انسان خواہشات کا اسیر ہو چکا ہو لہذا ایسی مجبوری میں سربراہ حکومت کے انتخاب کیلئے "اکثریت آراء" کا سہارا ہی واحد حل تھا۔

لہذا عصر حاضر میں سربراہ حکومت یا کسی اور موقعوں پر ووٹنگ (Voting) کے ذریعہ منتخب ہونا یہ ایک تقلیدی نظام ہے جس کا کوئی ربط اسلام سے نہیں ہے۔

اور جن لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے بعد کے خلیفہ کا انتظام انتخاب امت کے سپرد کیا تھا وہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کا مقصد اکثریت آراء تھا چونکہ اس کا کوئی ثبوت گذشتہ تحریروں میں نہیں ملتا۔

اور جیسا ابھی ثابت کر چکا ہوں کہ اکثریت بھی خطا سے محفوظ نہیں ہے لہذا ایسی صورت میں ہمارے لئے روا نہیں ہے کہ اس غلط نظام کی نسبت اس کی طرف دیں جس کی گفت روحی کی ترجمان اور حق کی ناشر تھی۔

اور اگر "اکثریت آراء" کے بجائے کوئی یہ کہے کہ خلیفۂ مسلمین کی تعین کا کام آنحضرتؐ نے "اتفاق امت" پر چھوڑ دیا تھا تو یہ بھی غلط ہے اس طرح

کے نظریات اسی وقت صحیح ہوں گے جب یہ مان لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فعل محال سرزد ہو سکتا ہے اور خود حضرت نے عمداً لوگوں کو اس کشمکش میں مبتلا کیا تاکہ اسلام زمین پر کمزور ہوتا رہے، جانیں ضائع ہوں اور مسلمانوں میں مادی و اخلاقی زوال پیدا ہو جائے۔

لیکن ہادیٔ بشریت و صاحب وحی و رسالت کے لئے ایسی باتیں سوچنا بھی گناہ ہے۔ لہٰذا تعیین خلیفۂ رسول کے لئے نہ قانون "اکثریت آراء" صحیح اور نہ قانون "اتفاقِ امت" درست ہے۔

اور اگر اس کے قائل ہو جائیں کہ آنحضرتؐ نے اپنے جانشین کے انتخاب کا حق ارباب حل و عقد کے سپرد کیا تھا تو بھی مشکل کا حل نہیں بن سکتا کیونکہ ارباب حل و عقد اور اکابر امت تو خود اختلاف و انتشار کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ لہٰذا خواص میں عوام کی طرح جہاں نفسانی اختلاف اور جذباتی کشمکش تھی وہیں دوسروں کی بہ نسبت شدید تعصب کا شکار بھی تھے، ارباب حل و عقد میں شاذ و نادر ہی کوئی رہا ہو جسمیں ذاتی اغراض اور شخصی خواہشات نہ پائے جا رہے ہوں یہی وجہ تھی کہ ان میں کی ہر فرد اپنے امکان کے بقدر منصب خلافت کی آرزومند تھی۔

یہ ممکن ہے کہ خود خلافت کے خواہشمند افراد ایک انسان ہونے کی وجہ سے آرزوئے منصب کرتے رہے ہوں جس کی خود ان کو خبر نہ ہو یا خلافت کی تمنا کرنے کو غلط نہ سمجھتے رہے ہوں یا اپنے میں دوسروں کی بہ نسبت صلاحیت خلافت زیادہ پاتے رہے ہوں۔ لہٰذا خواہشات نفسانی نے

انہیں وہ دلیلیں فراہم کیں جس سے وہ اپنے عقیدہ و نظریہ کو مستحکم کرتے ہوئے

خلیفہ بن بیٹھے۔

بلاشبہ ابوبکر کو معلوم تھا کہ ارباب حل و عقد کے فیصلے سے خلیفۂ وقت کا چناؤ نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ خود اسی راہ سے خلیفہ بنے تھے۔ لہٰذا اپنے بعد کے خلیفہ کا تعین انتخاب کے ذریعہ نہیں کیا۔ سقیفہ میں ان کے چناؤ کے وقت ان پر جو گذری، جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھی، سقیفہ کا چناؤ اس لئے نافذ ہوگیا کہ مدینے والے آنحضرت کے ارتحال کی وجہ سے مشغول تھے۔

ابوبکر کے جانشین، عمر نے خلیفۂ وقت کے انتخاب کے لئے ششش نفری شوریٰ کی تشکیل کی جس کا ارباب حل و عقد سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اگرچہ یہ لوگ چھ نفر سے زیادہ نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان میں اتحاد رائے کسی طور سے نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی رسہ کشی رہی، حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے الفاظ ہیں ــــــ

عمر بلاشبہ آگاہ تھے کہ ششش نفری جیسی مختصر سی جماعت میں بھی اتحاد ممکن نہیں ہے لہٰذا اکثریت کے فیصلے کو ترجیح دی اور اگر طرفین مساوی ہوگئے تو رجحان اس گروپ کو تھا جس میں عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔

یہی نہیں بلکہ اس ششش نفری کمیٹی پر پچاس آدمیوں کو مسلط کیا کہ وہ زبردستی پانچ آدمیوں کو ہم خیال کریں اور اگر کوئی ایک مخالف ہو تو اس کی گردن اڑادی جائے۔

عمر نے یہ ساری قید و شرط کیوں لگائی یہ کیوں کہا کہ اگر تین دن

کے اندر شش نفری کمیٹی کسی فیصلے تک نہ پہنچی تو قتل کر دیا جائے گا ـــــ بلا شبہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر نرمی کی جائے گی تو باہمی خون خرابہ ہو جائے گا، لہٰذا اس کشت و کشتار سے بچنے کے لئے عمر نے یہ روش اختیار کی چونکہ عموماً سربراہ کی تعیین کشت و خون کے بغیر انجام نہیں پاتی۔

اس روش کو ایجاد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ عمر اپنے بعد کے لئے کسی خلیفہ کی تعیین نہیں کرنا چاہتے تھے اور جن تین آدمیوں کی طرف ان کا میلان تھا وہ دنیا سے جا چکے تھے ـــــ یعنی ابو عبیدہ جراح، سالم مولیٰ ابو حذیفہ اور معاذ بن جبل۔

مجھے قطعاً تعجب نہیں کہ ابو بکر و عمر نے اگر اپنی چالاکی سے یہ بھانپ لیا کہ خلافت کی تعیین اگر عوام سے متعلق کر دی جائے گی تو خون خرابہ ہو گا بلکہ تعجب تو ان لوگوں پر ہے جو صاحب وحی پیغمبر کی طرف اس خونی نظام کی نسبت دیتے ہیں، جس نے وحی کے بغیر کوئی حکم ہی نہیں دیا۔

لطف تو یہ ہے کہ اس عظیم بہتان اور غلطی کے بعد بھی لوگ اپنے کو مسلمان اور عارف رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہتے ہیں۔

محاصرے کے دوران موت و حیات کی کشمکش میں بھی اگر لوگوں نے عثمان کی بات مان لی ہوتی تو وہ اپنے بعد کے خلیفہ کا تقرر کر دیتے۔ لیکن یہ ان کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ ہر طرف سے گھراؤ کرنے والے خلافت سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

میرے خیال میں اس نظام (ارباب حل و عقد) کے ناکارہ ہونے

کی مضبوط دلیل یہ ہے کہ اس راہ سے سوائے ابوبکر اور حضرت علیؑ کوئی دوسرا خلیفہ منتخب نہیں ہوا۔

"عمر کے بقول ــــ ابوبکر کی بیعت ایک حادثہ ہے جس کی حقانیت کی کوئی دلیل نہیں، خدا مسلمانوں کو اس بیعت کے شر سے محفوظ رکھے۔"

اگرچہ خود عمر نے ابوبکر کی خلافت کے پائے مضبوط کئے تھے، اور یہ بھی کہا تھا ــــ

"اگر کسی نے اس انداز سے بیعت کا مطالبہ کیا تو نہ اس کی بیعت کی کوئی اہمیت ہے اور نہ بیعت کرنے والوں کی کوئی ذمہ داری ہے۔"[1]

ارباب حل وعقد نے حضرت علیؑ کی خلافت کو قانونی درجہ دیا اور خود ان ہی لوگوں نے بیعت سے ہاتھ کھینچ لیا درآنحالیکہ زمانۂ آنحضرتؐ کو زیادہ دن نہیں گذرا تھا ــــ اور بیعت توڑنے والے بھی بزرگ اصحاب تھے۔

نتیجہ میں جنگ جمل وصفین کا رن پڑا اور ہزاروں بے گناہ مارے گئے شریعت کی توہین ہوئی اور اسلامی پیشرفت کو دھچکہ پہنچا۔

ابوبکر اور حضرت علیؑ کے علاوہ جو بھی خلیفہ بنا استخلاف یعنی خلیفۂ قبل نے نامزد کیا یا تلوار کی باڑھ نے دہلیز اقتدار تک پہنچایا۔

---

[1] کنز العمال ج ۳ ص ۲۳۲۶

تلوار نے اس راہ میں نمایاں کردار ادا کیا، ملت اسلامیہ کو خون کے

دریا میں ڈبو دیا۔

اسی تصوّر نے کہ خلیفۂ رسول کی تعیین کا حق عوام کو ہے، خلافت کے حریصوں کو بے دریغ کشت و خون پر اکسایا۔

اسی تصوّر سے طلحہ و زبیر کو جنگ جمل کا موقع ملا اور معاویہ میں ہر جرم کے کرنے کی جرأت پیدا ہوئی، عبد اللہ بن زبیر نے چند روزہ خلافت پائی اور بنی عباس کو بنی امیّہ کے خلاف صف آرائی کا موقع ملا۔ اس تصوّر نے کہ سربراہ کا انتخاب عوام کے ہاتھوں میں ہے، تاریخ کو رنج و محن سے بھر دیا۔

جب میرے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ عوامی انتخاب ایک ناقص و ناکارہ نظام ہے — پھر کیونکر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ جیسا حکیم الٰہی اس نظام کو معین کر سکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو اس نظام کے باطل و فاسد ہونے کی خبر نہ ہو لیکن ام المؤمنین عائشہ اس سے باخبر ہوں لہٰذا ایک دن عمر کے پاس ان کے بیٹے عبد اللہ کے ذریعہ کہلایا کہ —

"آنحضرتؐ کی امت کو بغیر سرپرست نہ چھوڑنا۔ ان کے لئے کسی خلیفہ کو معین کرو کیونکہ تمہارے بعد کہیں اختلاف و انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔"

پتہ نہیں کیوں کسی نے آنحضرتؐ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ اپنے

بعد کے لیے خلیفہ معین فرما جائیں یا کم از کم طریقۂ انتخاب ہی بتا جائیں ورنہ لوگوں میں پھوٹ پڑ جائے گی، جس طرح عائشہ نے عمر سے کہا تھا؟

یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال نہ کیا ہو جبکہ ہر چھوٹے بڑے سوال کر رہے تھے۔

حق تو یہ ہے کہ حضرتؐ سے پوچھا بھی گیا اور آنحضرتؐ نے جواب بھی دیا لیکن تاریخ نے ان جیسے موارد سے چشم پوشی کی۔ جبکہ شیعہ تاریخ میں ایسے سوال وجواب کا سراغ ملتا ہے۔

عوامی انتخاب بلادلیل ہے

خلیفۂ رسولؐ کی تعیین میں عوامی انتخاب سے متعلق جتنی خرابیاں گزشتہ سطروں میں پیش کیں اگر سب سے چشم پوشی کر لوں تو بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ میں اس نظام کے حامیوں سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بتائیں کہ عوامی الیکشن کی حقانیت وصحت پر کتاب وسنت میں کون سی دلیل آئی ہے؟

اے کاش کوئی بتاتا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "خلیفہ کے انتخاب کا حق ارباب حل وعقد کو ہے"۔

جب کہ اس طرح کی باتوں کو بآسانی نقل ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ آغاز اسلام سے اقتدار انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو اس طرح کی باتوں کے طرفدار و دعویدار تھے۔ لہٰذا ایسی صورت میں کوئی یہ نہیں

کہہ سکتا کہ اس طرح کے آثار ہم سے پوشیدہ رہے یا راویوں نے نقل نہیں کئے۔ جبکہ اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے :

"تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور اس انتخاب کا حق تم لوگوں کو نہیں ہے[1]۔"

لہٰذا نہ یہ کہ پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے ایسا کوئی ارشاد نہیں جس سے پتہ چلے کہ عوام کو سربراہِ امتِ اسلامیہ کے انتخاب کا حق دیا ہے بلکہ قرآن نے صراحت فرمادی ہے کہ عوام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی کو منتخب کرے۔

سوال

کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ — آنحضرتؐ اپنے بعد کے خلیفہ کے موضوع سے بے خبر نہیں تھے لیکن بطور نص یعنی صراحت سے اپنے کسی صحابی کو جانشین نہیں بنایا۔ لہٰذا حضرت کے اس انداز نے ثابت کر دیا کہ حضرت کی مراد یہی تھی کہ ان کا خلیفہ عوام کی رائے سے چنا جائے۔

جواب

پہلی نظر میں تو یہ فکر صحیح معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ نے بطور

---

[1] قصص/۶۸

نص صراحۃً کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا ـــ لیکن در حقیقت یہ غلط ہے کہ آپ نے بطور نص کسی کو خلیفہ معین نہیں کیا ـــ لہٰذا ضروری ہے کہ اس نص کا جائزہ لیں جو شیعہ و سنّی، ابو بکرؓ و علی بن ابی طالبؑ کے لئے بیان کرتے ہیں ـــ اگلے صفحات میں اس کی طرف بحث کروں گا۔

مسئلہ خلافت نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا خود بھی آنحضرت کو اس کی خبر تھی کہ ان کے بعد امت میں خلافت کے موضوع پر شدید اختلاف رونما ہوگا، جنگ کا بازار گرم ہوگا، مسلمانوں کے وقار کو ٹھیس پہنچے گی اور اسلام کا بھرم جاتا رہے گا ـــ کیا ان حالات میں آنحضرتؐ کا جانشین معین نہ کرنا صحیح ہے؟ یہ باتیں تو کسی عاقل رہنما کیلئے بھی روا نہیں ہیں؟

اور ـــ جب آنحضرتؐ نے بذریعہ نص کسی کو نامزد نہیں کیا تو کیا آپ کے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ صراحت فرمادیتے کہ میں نے ـــ خلیفہ کی تعیین کا کام حل و عقد کے سپرد کیا ـــ یا ـــ اس کا حق اہل مدینہ کو ہے ـــ یا یہ خلافت پایۂ تخت کے عوام میں محدود رہے گی..... اور پھر انہیں میں سے کسی ایک یا دو کے سپرد فرمادیا ہوتا (جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ بھی ہے)

بہر حال حضرتؐ کو چاہیئے تھا کہ امام کے شرائط بتا دیتے تا کہ لوگ اسی روشنی میں خلیفہ کا چناؤ کر لیتے۔

کیا آنحضرتؐ کی خموشی کے بعد وہ شخص مستحقِ عقاب و کافر قرار

پائے گا جو نہ حل و عقد کو تسلیم کرتا ہے اور نہ کثرت آرار کو حق سمجھتا ہے؟

بار الہا — ! تو گواہ رہنا، سمجھ میں نہیں آتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکوت کو کیونکر دلیل قرار دوں وہ بھی خلافت جیسے عظیم مسئلے میں جو ہر عہد و زمانہ کے مسلمانوں کے لئے اختلاف و انتشار کا سبب ہے جبکہ حق تو یہ تھا کہ خلیفہ کی تعیین صاف و صریح دلیل کے ذریعہ پیش کی جاتی!

خدایا — ! تو شاہد ہے کہ اس طرح کی کسی چیز پر اسی وقت ایمان لاسکتا ہوں جب عقل و خرد کے سرمایہ کو بالائے طاق رکھدوں۔

اختلافِ امت رحمت

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری گزشتہ سطریں جسمیں ارباب حل و عقد سے متعلق بحث کی ہیں وہ عقیدہ کی گرفت سے خارج نہ ہوسکیں جبکہ میں نے یہ طے کیا تھا کہ جو کچھ کہوں گا ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے کہوں گا۔

لیکن آپ ہی فرمائیں کیونکر اپنے ہیجان و اضطراب کو کم کروں اور آنحضرتؐ کے خاموش رہنے کی کیا توجیہہ کردوں۔

کیا اپنے کو اس حدیث کی روشنی میں مطمئن کردوں جسمیں آپ نے فرمایا تھا — ہماری امت کا اختلاف رحمت ہے — چونکہ آپ کو اپنی امت سے حد درجہ مہر و محبت تھی لہذا اس رحمت کی خاطر صاف

واضح کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا۔

ضرورت ہے اسلامی بنیادوں اور اصولوں کی روشنی میں اس حدیث کی توجیہ و تفسیر[1] کی جائے ورنہ اس طرح کی حدیث اس نبی اعظمؐ پر شدید بہتان ہے جو اتحاد کا نقیب، جس نے اسلامی اخوت کے ذریعہ عربوں کو زمانۂ جاہلیت کے دیرینہ تعصب و اختلاف و انتشار سے چھٹکارا دلایا۔

اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اور ظہور اسلام کا سب سے بڑا اثر یہی ہے کہ اس نے لوگوں کو ایسے اعلیٰ اتحاد کی دعوت دی جس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں، اسلام نے قوموں اور قبیلوں میں پائی جانے والی ہر قسم کی غیریت و دوئی کو مسمار کر کے رکھ دیا۔

اسلام کا نعرہ ہی ہے:

انما المؤمنون اخوۃ ـــــ مومن بھائی ہیں۔

---

[1] یہ حدیث شیعہ و سنی دونوں فرقوں میں پائی جاتی ہے لیکن حضرات ائمہ علیہم السلام نے جو توجیہ فرمائی ہے وہ ظاہر حدیث سے بالکل مختلف ہے۔

ایک شخص نے امام صادقؑ سے سوال کیا یہ حضرتؐ کی حدیث ہے تو آپ نے فرمایا: ہاں جس پر سوال کرنے والے نے کہا کہ اگر اختلاف رحمت ہے تو اجتماع عذاب ہے جس کے جواب میں فرمایا: اس حدیث کے وہ معنی نہیں جو تم لوگ سوچ رہے ہو۔ یہ حدیث آیۂ لولا نفر من کل فرقۃ ــــ کی تفسیر ہے۔ یہاں اختلاف سے مراد لوگوں کا آنحضرتؐ کی خدمت میں سوالات کے لئے آمد و رفت رکھنا ہے اور پھر اپنے ملکوں میں پھیل جانا ہے۔ اسی مضمون کو مرحوم صدوق نے

اسلام نے باہمی اتحاد و دوستی پر جس قدر زور دیا اور اس کو مستحکم بنانے میں جتنی سعی کی اس کے بیان و برہان کی ضرورت نہیں، اسلام کا منشا تھا کہ مومنین آپس میں آہنی دیوار بن کر ایک دوسرے کو اپنے وجود سے شکست ناپذیر بنا دیں، اسے عملی بنانے کے لئے نماز جماعت و جمعہ کا حکم دیا، حج کو واجب قرار دیا، غیبت، عیب جوئی، تحقیر اور بہتان کو حرام بتایا اور اس جیسے بے شمار احکام ہیں جس سے شیرازہ اسلام کو بکھرنے سے روکا ہے۔

کیا ان شواہد کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت نے اختلاف کی طرف لوگوں کو دعوت دی بلکہ اس اختلاف کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے بھرپور کوشش کی درحقیقت یہ آنحضرت پر صریحی جھوٹ اور بہتان عظیم ہے۔ کریم! لغزش فکر و قلم سے پناہ مانگتا ہوں۔

حقیقت اجماع

حق تو یہ ہے کہ میں نے برادران اہل سنت میں کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلیفہ نامزد نہ کرنے کی وجہ ارباب حل و عقد کی موجودگی کو بتایا ہو، مگر معدودے چند۔ اور کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ پیغمبر اسلام کا خلیفہ معین نہ کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ارباب حل و عقد کے ذریعہ یہ مسئلہ حل کیا جائے۔

معانی الاخبار میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ اختلاف سے مراد آمد و رفت ہے، ورنہ اللہ کے دین میں اختلاف نہیں۔

ارباب حل و عقد کی حقانیت پر اہل سنّت کا استدلال یہ ہے کہ صدر اوّل کے مسلمانوں نے اسی راہ سے ابوبکر کو خلیفہ بنایا تھا لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ارباب حل و عقد کا اجماع کافی ہے۔

اہل سنت حضرات اجماع کو حجت سمجھتے ہیں چونکہ ان کے پاس حضرت کی یہ حدیث ہے :

"ہماری امت نہ غلطی پر اجماع کر سکتی ہے نہ گمراہی پر۔"

لیکن شیعوں کے نزدیک ایسا اجماع صحیح نہیں، ان کے یہاں اجماع اس وقت حق ہو گا جب امامؑ بھی اجماع کرنے والوں میں شریک ہو اور اجماع سے امامؑ کی منشاء ظاہر ہو رہی ہو چونکہ ابو بکر کی بیعت پر امیر المومنینؑ راضی نہیں تھے لہٰذا شیعوں کے نزدیک سقیفہ کا اجماع کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہی نہیں، شیعہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی طرح کے اجماع سے ابوبکر کی بیعت کو صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ــــ حق ــــ علیؑ کے ساتھ ہے۔ وہ جہاں ہوں گے حق وہاں ہو گا۔ سقیفہ میں وہ نہیں تھے لہٰذا حق وہاں نہیں تھا اور ساتھ ہی ساتھ بنی ہاشم نے بھی بیعت کا بائیکاٹ کیا، سعد بن عبادہ اور ان کے بیٹے نے اس بیعت کی مخالفت کی، جلیل القدر صحابہ مثلاً سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ، عمارؓ، زبیرؓ، خالد بن سعیدؓ، حذیفہ یمانیؓ بریدہؓ اور دوسرے اس اجماع کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اور اگر ان میں سے کچھ نے بعد میں بیعت کر لی بھی تو صرف اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد مقصود تھا۔ جن لوگوں نے بیعت نہیں ان کے لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ ارباب حل و عقد میں نہیں تھے کیونکہ ان کی سیرت و زندگی سے کون بے خبر ہے۔

شیعہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر — اجماع — صحیح تھا تو بعد میں کسی خلیفہ کا انتخاب اجماع سے کیوں نہیں ہوا کیونکہ ابوبکر کے علاوہ جو بھی خلیفہ بنا یا اس کو اس کے بعد والے نے نامزد کیا یا تلوار کے زور سے اقتدار تک پہنچا — صرف ایک حضرت علیؑ تھے جن کی امامت پر آنحضرتؐ کی صراحت ہے آپ کے انتخاب میں عوام کا کوئی دخل نہیں۔

یہی وہ باتیں ہیں جس پر دونوں فرقے آپس میں اختلاف رکھتے ہیں میں دونوں کی دلیلوں کے سامنے دم بخود ہوں۔

میری کوشش ہے کہ حادثہ سقیفہ کی مختلف پہلوؤں سے تحقیق کروں اس میں سب سے اہم مسئلہ انتخاب کا ہے۔

کیا مجھ میں یہ جرأت ہے کہ کسی ایک فریق کی حمایت میں رائے دوں؟ ابھی جلدی ہے آئندہ صفحات حقیقت کی خود ترجمانی کریں گے۔

اگرچہ میری دلی خواہش تھی کہ حادثہ سقیفہ کی تحقیق سے پہلے بلکہ حضرت علیؑ کی امامت کے شواہد کے ذکر کرنے سے پہلے بحث کا نتیجہ و نچوڑ پیش کروں لیکن مسائل کچھ ایسے گڈمڈ اور باہم دست و گریباں ہیں کہ ناچار آئندہ صفحات کا انتخاب کرنا پڑا۔

میں یہی چاہتا ہوں کہ طرفین کی دلیلوں سے قطع نظر گذشتہ مباحث کی مدد سے وہ بات پیش کروں جو عقل و دانش سے قریب ہو۔ بشرطیکہ آپ تھوڑی دیر میرے ساتھ رہیں۔

ہم آپ دونوں ہم خیال ہیں کہ آنحضرتؐ نے انتخابِ امامت سے متعلق اربابِ حل و عقد کو کوئی حق نہیں دیا درآنحالیکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ حضرتؐ اس موضوع کو صاف و صریح ذکر فرماتے۔ کیوں پیغمبر اسلامؐ خاموش رہے؟

کیا عمداً ایسا کیا تاکہ مسلمان گردابِ نزاع و اختلاف میں پھنسے رہیں یا کوئی قانون بنا کر گئے ہیں ۔۔۔ ؟

حق یہ ہے کہ کوئی قانون مرتب نہیں فرمایا جس سے خلیفہ معین کیا جا سکے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اجماع کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی چونکہ پیغمبر اسلامؐ کا مقرر کردہ قانون نہیں ہے۔ نہ حضرت باری تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ اس کی حقانیت کی گواہی دلائی ۔۔۔ بلکہ گذشتہ صفحات پر یہ لکھ چکا ہوں کہ دلیلیں تو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اجماع قطعاً باطل ہے آنحضرتؐ نے بنام اجماع کوئی قانون مرتب نہیں فرمایا تھا۔

لہٰذا ایسی صورت میں اجماع بھی آنحضرتؐ پر ایک تہمت ہے جیسی اور تہمتیں لگائی گئیں۔

یہ تو ایک رخ تھا ۔۔۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ جو افراد سقیفہ میں جمع ہوئے تھے ان کی وہاں موجودگی کی کیا دلیل تھی کیا اہل مدینہ اور

مسلمانوں سے مشورہ کر کے وہاں اکٹھا ہوئے تھے؟

اس اجتماع کے برحق ہونے کا انحصار ۔ اجماع۔ پر ہے درآنحالیکہ خود اجماع ہی ثابت نہیں ۔ لہٰذا سقیفہ کی کاروائی ابتداً سے بے اساس و بے بنیاد تھی ۔ اسی لئے تو عمر بن خطاب سعد بن عبادہ کے لئے کہتے تھے کہ ۔۔۔ :

"اس فتنہ گر کو قتل کرو خدا برباد کرے"۔

سوال یہ ہے کہ سعد بن عبادہ کیوں لائق گردن زدنی ہیں جبکہ ان کا اتنا ہی قصور تھا کہ انہوں نے بغیر کسی ثبوت محکم کے اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھتے ہوئے بیعت کا مطالبہ کیا ۔ اگر آنحضرت نے خلیفہ کی تعیین کا حق ارباب حل و عقد کو دے دیا تھا تو اس کی روشنی میں سعد بن عبادۃ لائق گردن زدنی نہ تھے اور اگر سعد کا دعوائے خلافت غلط ہے تو جو بھی بغیر کسی دلیل محکم کے دعوائے خلافت کرے وہ بھی بقول عمر سرا اڑا دینے کے لائق ہے ۔

کیا حاکم قریشی ہو گا ؟

"الائمۃ من قریش" آنحضرتؐ کے خلفاء و جانشین قبیلہ قریش سے ہوں گے کیا اس حدیث سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے ؟ مہاجرین اس وقت تک اس حدیث سے آشنا نہیں تھے یا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس حدیث سے استدلال کریں اسی لئے قول صحیح کی بناء پر اس حدیث سے استدلال نہیں کیا گیا ۔

صرف ابوبکر تھے جنھوں نے رسول اکرمؐ سے اپنی قرابتداری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ـــــ :

"عرب، قریش کے علاوہ کسی کے لئے خلافت کے روادار نہیں ہیں۔"

خلافتِ ابوبکر کی دلیل

گذشتہ صفحات میں یہ ثابت نہ کر سکا کہ آنحضرتؐ نے تعین امامت کا حق ارباب حل و عقد یا امت اسلامیہ کے سپرد کیا تھا، اس جگہ اس موضوع کو عنوان قرار دے رہا ہوں کہ اگر آنحضرتؐ نے امام و خلیفہ معین فرمایا تو وہ کون تھا؟

کیا یہ صحیح ہے کہ وہ خلیفہ ابوبکر ہیں۔ ؟

اگر کوئی تحقیق کی نگاہ سے مطالعہ کرے گا تو اس پر واضح ہوجائیگا کہ وہ روایتیں جو ابوبکر کی خلافت کی دلیل و نص ہیں ساری کی ساری جھوٹی و جعلی ہیں، کیونکہ خود ابوبکر کہتے ہیں ـــــ :

"اے کاش بوقت آخر آنحضرتؐ سے پوچھ لیا ہوتا کہ ان کا جانشین کون ہوگا اگر یہ معلوم ہوجاتا تو جو خلافت کے اہل تھے ان سے برسر پیکار نہ ہوتا۔"

اس سے واضح ابوبکر کے جانشین عمر کا قول ہے جس کو موت سے قبل کہا تھا ـــــ :

"آنحضرتؐ نے جانشین معین نہیں کیا تھا۔"

ایک وضاحت حضرت عائشہ کی زبان سے بھی ہے درآنحالیکہ وہ اپنے والد ابوبکر کی خلافت کو مضبوط بنانے میں بہت سرگرم تھیں لیکن جب ان معظمہ سے پوچھا گیا کہ آنحضرتؐ نے کس کو خلیفہ بنایا تو فرمایا ــــــ :

"حضرتؐ نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا"

حیرت ابن حزم سے ہے ــــ قول عمر کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عمر کو اگر خلافتِ ابوبکر کی نص نہیں معلوم تھی تو کوئی تعجب نہیں انھیں بہت سے اوامر رسولؐ خدا کی خبر نہیں تھی یا ممکن ہے عمر و عائشہ کا مقصد یہ رہا ہو کہ آنحضرتؐ نے کسی کو تحریری طور پر خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا ــــ یہ تو صحیح ہے کہ، تحریری طور سے کسی کو آنحضرتؐ نے خلیفہ معین نہیں کیا تھا اگر عمر و عائشہ کو خلافت ابوبکر کے شواہد معلوم نہیں تھے تو دوسرے بدرجہ اولیٰ اس سے بے خبر رہے ہوں گے۔

لیکن بعید ہے کہ عمر و عائشہ کے انکار سے یہ مراد ہو کہ کوئی تحریری دستاویز نہیں تھی۔

عائشہ و عمر کے انکار کے بعد ابوبکر کی خلافت کا اعتبار جاتا رہا اور جب نص کا یہ حال ہے تو اسی نص کی روشنی میں اجماع کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے اور سقیفہ کی ساری کاروائی بھی بے نقاب ہو جاتی ہے،

ابوبکر، سقیفہ کے دن ابوعبیدہ اور عمر کو خلافت کے لئے مقدم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ــــــ :

"میں ان میں سے کسی ایک کی خلافت پر راضی ہوں۔"

اگر آنحضرت نے انہیں نامزد کیا ہوتا تو انہیں اس کی خبر ہوتی اور اگر بارِ خلافت سے انکار مقصود تھا تو اس کی طرف اشارہ کرتے جبکہ ان کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے متعلق کسی نص کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی بارِ خلافت اٹھانے سے انکار تھا۔

اس سے واضح تر خود ابوبکر کا اسی دن کا خطبہ ہے جس میں کہا:

"عرب اس منصب خلافت کو قریش کے علاوہ کسی کیلئے روا نہیں سمجھتے چونکہ یہی قریش خاندان و نسب کے اعتبار سے دوسروں سے بہتر ہیں۔"

اگر ابوبکر کے لئے آنحضرتؐ کی طرف سے کوئی نص ہوتی تو عرب خود غیر از ابوبکر کسی کے لئے خلافت کو پسند نہ کرتے۔ اور ابوبکر بھی بغیر کسی شرم و حیا کے خلافت کی آمادگی کا اظہار کر دیتے۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ ابوبکر کی خلافت کے لئے کوئی نص نہیں تھی جو بھی ہے وہ فرضی و جعلی ہے۔

اس جعل کی وجہ یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے ابوبکر کی خلافت کی مخالفت کی وہ ایسے نہیں تھے جنہیں نظر انداز کیا جا سکتا اور اجماع کی سپر سے ان کی مخالفت کا دفاع بھی ممکن نہیں تھا لہٰذا ناچار یہ حدیثیں استحکام خلافت کی خاطر گڑھی گئیں ہیں۔

یہ وہ اسباب و علل تھے جس نے ایسے صریح جھوٹ پر اکسایا جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حدیثیں طالب حق و حقیقت کی راہ کا روڑا بن گئیں۔

ان جھوٹی حدیثوں کا اثر یہ بھی ہوا کہ ایسے راویوں کی روایت سے اعتبار و اعتماد جاتا رہا جن کی طرف یہ جعلی و نقلی حدیثیں منسوب ہوئیں۔

داستانِ نماز

اہل سنت کی ایک دلیل خلافت ابو بکر کے برحق ہونے کی یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی بیماری میں مسلمانوں کی امامت کی تھی۔

یہ تو صحیح ہے کہ ابو بکر نے مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھی لیکن اگر اسے صحیح مان لیا جائے کہ انہوں نے نماز پڑھائی تو اس سے نص تو درکنار اشارہ بھی نہیں ملتا کہ وہ مسلمانوں کے آنحضرت کے بعد خلیفہ و امام ہیں۔

چونکہ نماز کی امامت کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ جس نے نماز پڑھادی بس وہ خلیفہ ہو گیا وہ بھی اس وقت جب اہل سنت کے یہاں ہر فاجر و فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

عصر پیغمبر اسلامؐ کا معمول تھا کہ لوگ آنحضرتؐ کی ایماء پر ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز جماعت پڑھتے۔

خود اس کی تائید روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب ابو بکر، عمرو بن عوف کے خاندانی اختلاف کو حل کرنے گئے تو مرسل اعظمؐ کی اجازت کے بغیر نماز جماعت پڑھائی۔

مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ روایت صحیح ہو کہ آنحضرتؐ نے کچھ دن ابو بکر کو نماز جماعت پڑھانے پر مامور کیا تھا چونکہ یہ مسلّمہ ہے کہ ابو بکر لشکر اسامہ میں شریک تھے جو مدینہ سے باہر تھا، آئندہ اس کی طرف اشارہ ہو گا کہ — آنحضرت نے لشکر میں شامل ہونے کا حکم دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ لشکر فوراً روانہ ہو جائے — ایسی صورت میں یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ ابو بکر نے آنحضرت کی نیابت میں نماز پڑھائی۔

یہ ملتا ہے کہ جس دوشنبہ کو آنحضرتؐ کا ارتحال ہونا ہے ابو بکر نے نماز صبح منعقد کی لیکن نماز ختم ہونے سے پہلے ہی آنحضرتؐ بیت الشرف سے دو آدمیوں کے کاندھوں پر سہارا دیتے ہوئے برآمد ہوئے۔ پائے مبارک درد کی وجہ سے زمین پر خط دیتے جا رہے تھے — لوگوں نے آپؐ کی اقتداء میں نماز ادا کی ابو بکر آپ کے پیچھے ہو لیے۔

ابو بکر کی نماز پڑھانے والی روایت کی تنہا راوی عائشہ ہیں۔ انہوں نے حضرتؐ سے اس قدر سوالات کئے کہ حضرتؐ نے غضبناک ہو کر فرمایا:

"بلاشبہ تم لوگ صواحب یوسف ہو"

یعنی جس طرح مصر کی عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو راہ صحیح سے منحرف کرنا چاہا تھا تم بھی مجھ کو حق کی راہ سے منحرف کرنا چاہتی ہو۔

ایک طرف عائشہ سے یہ روایت ہے کہ ابو بکر نے نماز پڑھائی دوسری طرف انہیں معظمہ سے یہ روایت ہے کہ — روز وفات بیت الشرف سے اسی نماز کو پڑھانے کے لئے تشریف لائے جبکہ ضعف سے دو آدمیوں کے

کاندھوں پر تکیہ کئے ہوئے تھے[1]۔

اگر آنحضرتؐ نے ابوبکر کو نماز کے لئے اس لئے بھیجا تھا کہ لوگوں کو اشارہ مل جائے کہ وہ ان کے جانشین و خلیفہ ہیں تو پھر کیوں دردِ پا کے باوجود بیت الشرف سے نکلے اور لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھائی۔

بے جا صفائی

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ صف جماعت میں ابوبکر نے آنحضرتؐ کی اقتدار کی لیکن مسلمانوں نے ابوبکر کی ــــ مگر یہ توجیہ بالکل غلط ہے کیونکہ امامت بہرحال سرکار رسالتؐ فرما رہے تھے کیونکہ اگر امام جماعت ابوبکر تھے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ خود ابوبکر نے آنحضرتؐ کی اقتدار نہیں کی اور اگر سرکار رسالت امام جماعت تھے تو پھر نمازیوں نے ابوبکر کی اقتدار نہیں کی

اگر اس واقعہ کو بہت زیادہ اہمیت دی جاسکتی ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم چونکہ بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے اور ابوبکر بالکل ان کی پشت پر کھڑے تھے لہٰذا جماعت والوں نے ضعف کی وجہ سے نہ حضرت کی قرائت سنی اور نہ ہی بیٹھ کر پڑھنے کی وجہ سے آپؐ کا رکوع و سجود دیکھا بلکہ حضرتؐ کے عمل کی تشخیص ابوبکر کے ارکان سے دی۔

---

[1] بخاری ج ۱ حدیث ۸۷ ــ ۸۴ ــ صحیح مسلم باب استخلاف الامام از اعرض لہ من کتاب الصلوٰۃ

اس طرح کی جتنی حدیثیں ہیں سب کی سب ام المومنین عائشہ سے مروی ہیں، جس میں اضطراب کے ساتھ ساتھ نو ۹ وہ جگہیں ہیں جس میں ضابطہ حدیث کی رو سے تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ انکار عمر

• بعض حدیثیں کہتی ہیں کہ جس وقت عائشہ نے سوال کیا کہ نماز کون پڑھائے گا تو آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا — :

"عمر سے کہو پڑھا دیں۔ لیکن عمر نے انکار کیا اور ابوبکر کو مقدم کیا۔"

• بعض حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے براہ راست عمر کو مامور کیا۔ لیکن عمر نے بلال کے ذریعہ آپؐ کو مطلع کیا کہ ابوبکر درِ مسجد پر موجود ہیں تب حضرتؐ نے ابوبکر کو حکم دیا۔

• بعض میں ہے کہ عمر نے حضرتؐ کی اجازت کے بغیر نماز پڑھا دی جب حضرتؐ نے عمر کی آواز سنی تو فرمایا:

"نہ خدا کو یہ پسند ہے اور نہ مومنین کو۔"

• بعض حدیثوں میں ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے ابوبکر سے کہا کہ جس نماز کو عمر نے پڑھایا ہے اس کو دوبارہ پڑھایا جائے۔

• کہیں پر ہے — عمر نے نماز پڑھائی، ابوبکر غائب تھے۔

• کچھ میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر سے نماز پڑھانے کے لئے کہا

ابوبکر نے عمر سے کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

۲. کس سے کہا؟

اس میں بھی اختلاف ہے کہ پیغمبرؐ نے نماز پڑھانے کا حکم کس کے ذریعہ دیا تھا۔ کہیں پر عائشہ کا نام ہے تو کہیں پر بلال و عبد اللہ بن زمعہ کا۔

۳۔ یا یہ یا وہ

• ابوبکر کی امامت کے لئے آنحضرتؐ سے کون ملا تھا۔ بعض حدیثوں میں ہے، تنہا عائشہ تین بار یا اس سے زیادہ آنحضرتؐ کے پاس گئیں تھیں۔

• کہیں پر ہے کہ ابتداء عائشہ نے کی پھر ایک بار یا دو بار حفصہ نے مراجعہ کیا تو حضرت نے انہیں ڈانٹا جس پر حفصہ نے عائشہ سے کہا تم کبھی میری خیر خواہ نہیں تھی۔

۴. کون سی نماز؟

یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ کون سی نماز تھی جس کے لئے حضرت نے مامور کیا تھا ـــــ بعض روایات نماز عصر بتاتی ہیں اور بعض میں عشاء و صبح کا ذکر ہے۔

۵۔ نکلے یا نہیں

بعض روایات بتاتی ہیں کہ آنحضرتؐ بیت الشرف سے مسجد میں

تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت نے پردے سے سر نکالا جب دیکھا کہ لوگ ابوبکر کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تو پردہ گرا لیا اور لوگوں کو نماز نہیں پڑھائی۔

۶۔ امامت کس کی؟

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرتؐ تشریف لائے ابوبکر نے چاہا کہ ہٹ جائیں لیکن حضرتؐ نے پشت ابوبکر پر ہاتھ رکھ کر انہیں روکا اور خود ابوبکر کی اقتداء کی۔

- بعض حدیثوں میں ہے کہ ابوبکر نے آنحضرت کی اقتداء کی۔
- کہیں پر ہے کہ ابوبکر نے آنحضرت کی اقتداء کی۔
- کہیں پر ہے کہ ابوبکر نے تو آنحضرت کی اقتداء کی لیکن مسلمانوں نے ابوبکر کی۔
- کہیں پر ہے کہ آنحضرتؐ نے اسی جگہ سے قرائت شروع کر دی جہاں تک ابوبکر پہنچے تھے۔

۷۔ کہاں بیٹھے؟

یہاں بھی اختلاف ہے کہ ابوبکر حضرت کے داہنی جانب بیٹھے تھے یا بائیں جانب۔

۸۔ مدّت نماز

بعض جگہوں پر ہے — جب سے مریض ہوئے ابوبکر نے نماز پڑھائی۔

کہیں ہے — سترہ نمازیں پڑھائیں۔

کچھ کہتی ہیں — تین روز تک، کچھ میں چھ روز اور بعض میں صرف ایک روز کا ذکر ہے۔

۹۔ حضرتؐ کی تشریف آوری

کچھ روایتیں کہتی ہیں حضرتؐ اسی نماز کے لئے تشریف لائے جس کے لئے ابوبکر کو مامور کیا تھا۔ بعض میں صراحت ہے کہ آنحضرتؐ نماز ظہر کے لئے تشریف لائے اور کچھ میں یہ ہے کہ نماز صبح تھی۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اصل واقعے میں کس قدر اختلاف ہے۔ روایات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے کتنی بار نماز پڑھانے کا حکم دیا اور کتنی بار بیت الشرف سے تشریف لائے۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جس سے حقیقت واقعہ کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ ان ساری روایات سے اجمالاً جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ابوبکر نے رسالتمآبؐ کی تشریف آوری سے پہلے ہی نماز پڑھا دی۔

میرا خیال ہے کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ جب رسالتمآب سے نماز پڑھائی

نہ گئی تو آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جماعت کے بغیر نماز ادا کر ڈالیں۔
لیکن کسی نے یہاں اپنی طرف سے فرمان حضرتؐ میں تصرف کر دیا۔ جب حضرت کو صورت حال کی اطلاع ہوئی ناچار درد پا کے باوجود دو آدمیوں کے کاندھوں پر تکیہ کئے ہوئے بیت الشرف سے باہر تشریف لائے، پائے مبارک زمین پر خط دیتے جا رہے تھے۔ شدّت ضعف سے حضرتؐ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی تاکہ لوگوں پر واضح ہو سکے کہ جو بھی ہوا وہ آپکی مرضی کے بغیر تھا۔

جس وقت عائشہ نے اپنے باپ ابوبکر کی امامت کے لئے سوال کیا تو حضرتؐ نے تیز و تند لہجہ میں عائشہ سے فرمایا:

"تمہارا وہی حال ہے جو حال
یوسف کو فریب دینے والی
عورتوں کا تھا۔"

آخر عائشہ نے کیا کیا تھا جو آنحضرتؐ نے اس قدر تیز و تند لہجہ میں ان کی توبیخ کی؟ کس بات کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا کہ آنحضرتؐ نے ایسی سخت مذمت فرمائی؟ اس کے علاوہ ان کا بظاہر کوئی اقدام نظر نہیں آتا کہ انہوں نے امامت مسجد کے شرف کو اپنے والد سے منسوب کرنا چاہا۔

حضرت رسالتمآب کا عائشہ کو اس لب و لہجہ میں توبیخ کرنا ہر صاحب نظر کو متوجہ کر دیتا ہے کہ شاخسانہ امامت عائشہ کا منصوبہ تھا۔ لہٰذا حضورؐ نے

ان کی اس تیز لہجہ میں سرزنش فرمائی۔

معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر کی امامت پر عائشہ کی توبیخ نہیں کی بلکہ اس سازش پر ناراض ہوئے جسے وہ چلا رہی تھیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ عائشہ کی بھرپور کوشش تھی کہ ہر طرح کی فضیلت ان کے والد سے منسوب ہو۔

خود یہی معظمہ ناقل ہیں کہ —— : اگرچہ میں نے بار بار آنحضرتؐ سے اپنے والد کی امامت کے لیے سوال کیا۔ لیکن بعد میں چاہتی تھی کہ وہ امام جماعت نہ بنائے جائیں کیونکہ کوئی بھی رسالتمآب کی جگہ ابوبکر کو دیکھنا گوارہ نہیں کر رہا تھا۔ لہٰذا اگر رسول خداؐ کو کچھ ہو جاتا ہے تو لوگ ہمارے والد کی امامت کو بدشگونی سے تعبیر کریں گے۔

یہ بیان اس کا ثبوت ہے کہ عائشہ کی کوشش تھی کہ ہر فضیلت کا مصداق ان کے والد قرار پائیں۔ لہٰذا جس وقت پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا : علیؑ کو بلا دو تاکہ کچھ ان سے وصیت کر دوں۔ عائشہ نے اپنے باپ ابوبکر اور حفصہ نے عمر کو بلا بھیجا۔ جب حضرتؐ نے ان لوگوں کو حضرت علیؑ کے ساتھ دیکھا تو فرمایا :

تم لوگ واپس جاؤ اگر ضرورت ہوگی

تو بلا لوں گا۔

اس طرح کی بات اس سے کہی جاتی ہے جس سے ناراضگی و برہمی

رہتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ان موارد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی ایسی چیز تھی جس کو ابوبکر کی خلافت کے لئے نص یا اشارہ قرار دیا جا سکے۔

خلافت علیؑ بن ابی طالب کی دلیل

اب اس کا جائزہ لینا ہے کہ وہ دلیلیں جن کو شیعہ حضرت علی علیہ السلام کے لئے پیش کرتے ہیں، صحیح ہیں یا نہیں۔

لیکن آپ سے گزارش ہے کہ غیر جانبدار ہو کر شیعہ دلائل کا جائزہ لیں، پہلے ہی سے ان لوگوں سے بدبیں نہ ہو۔ میں آپ کو شیعہ کتابوں کے پڑھنے کی دعوت نہیں دے رہا۔

صرف دقت نظر کو کام میں لاتے ہوئے فیصلہ کریں۔ ہو سکتا جس طرح سنّیوں نے ابوبکر کی دوستی و طرفداری میں بے بنیاد باتیں منسوب کی ہیں شیعوں نے علیؑ کی محبت و دوستی اور ان کی خلافت کے اثبات کے لئے کچھ ایسی باتیں گڑھ لی ہوں جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہو — لہٰذا بہتر ہوگا کہ ان کی کتابوں سے اس حقیقت کو تلاش نہ کریں بلکہ اہل سنّت کی صحاح اور ان کی دوسری کتابوں کو اپنی تحقیق کا محور قرار دیں کیونکہ جو کچھ اس میں علیؑ کے لئے ہوگا وہ ان کی مخالفت میں ہوگا نہ کہ حمایت میں چونکہ جن راویوں نے مدح و فضائل علیؑ میں روایت نقل کی کی تھی اکثر محدّثین نے ـــــــــــــــ

ان راویوں سے ـــــ گریز کیا۔

یا اس کی روایت میں ـــــ عیب لگایا۔

یا حدیث کے مرسلہ ہونے کا ـــــ خدشہ کیا۔

یا متن حدیث کو ـــــ غریب بتایا۔

یہ سب صرف اس لئے ہوا کہ اس راوی کی حدیثیں ان حضرات کے عقیدے سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

اس کے برخلاف محدثین کے نزدیک وہ راوی قطعاً ثقہ و معتبر تھا جو علیؑ سے بے تعلق رہا مثلاً ابو ہریرہ، مغیرہ بن شعبہ، عمران بن حطان وغیرہ۔

یہی نہیں، بنی امیہ کی تلواریں راویوں کے سروں پر کھنچی تھیں کہ علیؑ کی مدح و فضیلت میں کوئی حدیث پیش نہ کی جائے۔ سرکاری حکم پر علیؑ کو منبروں کی بلندیوں اور بازاروں و گذرگاہوں کے ہجوم میں گالیاں دی جارہی تھیں اور جو لوگ علیؑ سے گریزاں اور آپ کو برا بھلا کہہ رہے تھے، بنی امیہ کی طرف سے ان کی جھولیاں بھری جارہی تھیں۔

لہٰذا اگر ان پُرخطر گھاٹیوں سے گذر کر کوئی حدیث کتابوں میں جگہ پا جائے، ساتھ ہی ساتھ محدثین اس کی صحت کی تائید بھی کردیں، اور حدیث وافر مقدار میں بھی ہو تو ہمیں ایسی روایات کے صحیح ہونے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن میں ان صحیح روایات میں سے بھی معدودے چند کو پیش کروں گا جو اہل سنّت کے نزدیک متواتر یا قریب بہ متواتر ہیں۔

بلاشبہ حضرت علیؑ کی سرکار رسالتمآبؐ میں وہ قدرت و منزلت تھی کہ مسلمان رشک و حسد کرنے لگے۔ اس حقیقت کا انکار صرف ضدی و مغرور ہی کر سکتا ہے ورنہ ام المومنین عائشہ، جن سے علیؑ کے تعلقات کشیدہ تھے، وہ کہتی ہیں:

"علیؑ و زہراؑ سے زیادہ پیغمبرؐ کے نزدیک کسی مرد و عورت کو محبوب نہیں دیکھا۔"

بعثت سے دس سال قبل علیؑ کی ولادت ہوئی اس دن سے ارتحال کے آخری لمحے تک آپؐ اپنے داماد کے فضائل بیان فرماتے رہے۔ یہ بھی وہ حقیقت ہے جس میں کسی مسلمان کو کوئی شبہ نہیں۔ اس جگہ چند معتبر و مستند روایتوں کو پیش کرتا ہوں جس سے آپ کے خلیفہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۔ بعثت کے پہلے سال کا مشہور واقعہ ہے جب آیۂ کریمہ وانذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی جس میں پیغمبر اسلام کو حکم تھا کہ اپنے قرابتداروں کو ڈرائیں تو آپ نے اپنے اہل خاندان کے چالیس افراد کو جمع کیا سب کو اسلام کی دعوت دی اور حاضرین سے فرمایا:

"جس نے میری نصرت و مدد کی وہ میرے بعد

میرا بھائی، وارث، وزیر، وصی اور خلیفہ قرار پائے گا۔"

کسی نے وعدہ نہیں کیا صرف علیؑ تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کی مدد کا عہد و پیمان کیا، جس پر سرکار رسالتؐ نے علیؑ کو شانوں سے اٹھایا اور بلند کرتے

ہوئے فرمایا:

"یہ ہمارے بعد تمہارے درمیان ہمارے بھائی، وصی اور خلیفہ ہیں ان کی اطاعت کرنا۔"

حاضرین نے حضرتؐ کی تقریر کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا اور قہقہہ مارتے ہوئے ابوطالب سے مخاطب ہوئے:

"تمہیں تمہارے بیٹے علیؑ کی اطاعت کا حکم دیا ہے"[1]

۲۔ پانچویں ہجری تھی جب جنگ خندق ہوئی۔ عمرو بن عبدود کے مقابلہ پر علیؑ کو روانہ کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا:

برز الایمان کلّہ الی الکفر کلّہ

کلّ ایمان کلّ کفر کے مقابلے میں ہے۔

۳۔ ساتویں ہجری تھی جب لشکر اسلام خیبر میں شکست کھا کر پلٹا تھا اس وقت رسول اعظمؐ نے فخر و مباہات کرتے ہوئے فرمایا:

"میں کل علَم اس کو دوں گا جو خدا و رسولؐ کا محب ہے اور خدا و رسولؐ اس کے دوست، جو کرّار و غیر فرار ہو گا۔"

---

[1] استاد محمد حسنین ہیکل سے تعجب ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب "حیاۃ محمدؐ" کے دوسرے ایڈیشن سے اس واقعہ کو بغیر کسی نوٹ کے کاٹ دیا۔

ہر شخص گردن اٹھائے عَلم کا منتظر تھا لیکن آنحضرتؐ نے علیؑ کے حوالے فرمایا۔

۴۔ آنحضرتؐ نے جب ہجرت سے قبل مہاجرین اور پانچ ماہ مہاجرین وانصار کے درمیان برادری برقرار فرمائی تو علیؑ کو اپنا بھائی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، صرف فرق اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

آنحضرت مختلف مناسبتوں سے اس فقرے کی تکرار کرتے رہے۔

الف۔ اس وقت فرمایا جب سب کے دروازے مسجد میں بند کر دیئے گئے۔

ب۔ اس وقت بھی دہرایا جب ۹ھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر آپ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنایا تھا۔

ابن عباس کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آنحضرت نے علیؑ سے فرمایا:

"میری عدم موجودگی میں آپ میرے خلیفہ ہیں۔"[1]

۵۔ علیؑ سے متعلق سرکار رسالتؐ کا یہ ارشاد بھی ہے:

"تم سے محبت وہی رکھے گا جو مومن ہوگا اور دشمنی نہیں رکھے گا مگر منافق۔" اس ارشاد کے بعد منافق بغض علیؑ سے پہچانے جاتے تھے۔

۶۔ جس طرح میں نے تنزیل قرآن کے لئے جنگ کی ہے۔ اسی طرح تم

---

[1] اس روایت کو حاکم نے مستدرک اور ذہبی نے اپنی تلخیص میں صحیح قرار دیا ہے۔

میں کوئی ہے جو تاویل قرآن کے لئے جنگ کرے گا۔ جب سوال کرنے والوں نے پوچھا: کیا وہ ابوبکر و عمر ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ـــــ : نہیں، وہ ہے جو میری نعلین سی رہا ہے۔ علیؑ اسی وقت حجرۂ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا میں آپ کی نعلین سی رہے تھے۔

۷. آنحضرتؐ کے حضور بھنا ہوا مرغ رکھا گیا جس کو دیکھ کر حضرتؐ نے فرمایا:

"بار الٰہا! اس کو بھیج! جس کو تو لوگوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے جو ہمارے ساتھ اس مرغ میں شریک ہو جائے"

علیؑ تشریف لائے اور آنحضرتؐ کے ساتھ اس مرغ کو تناول فرمایا۔

۸. یہ بھی حضرتؐ کی ہی حدیث ہے:

"میں شہر علم ہوں علیؑ اس کا دروازہ ہے۔"

۹. یہ بھی سرکارِ رسالتؐ کا ارشاد ہے:

"علیؑ تم میں سب سے زیادہ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔"

۱۰. یہ بھی مرسل اعظمؐ کا بیان ہے:

"علی حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ۔ یہ دونوں حوض کوثر تک جدا نہیں ہوں گے۔"

۱۱. متعدد بار آپ کی وصایت و وراثت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: یہ وراثت و وصایت نبوت کی ہے۔ ایک بار کی لفظیں یہ ہیں:

"ہر نبی کا وارث و وصی ہوتا ہے۔ میرے وارث و

وصی علی بن ابی طالب ہیں۔"[1]

ایک بار علیؑ نے آنحضرتؐ سے سوال کیا: مجھے آپ سے کیا میراث ملے گی؟

جواب میں فرمایا: کتاب خدا و سنت رسول گذشتہ انبیاء نے جو میراث چھوڑا تھا وہی میری بھی میراث ہے۔[2]

۱۲۔ سنہ ۸ھ تھا جب یہ اشارہ فرمایا:

"علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے، لوگوں کی امانتوں کو یا میں خود ادا کروں گا یا علیؑ۔"

۱۳۔ اس طرح بھی رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:

"علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے، وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں۔

۱۴۔ حضرتؐ نے خود بھی مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"تم میرے بعد ہر مومن کے ولی ہو۔"

۱۵۔ مسجد رسولؐ میں جن کے دروازے کھلے تھے سب کو حضرتؐ نے

---

[1] صاحب میزان الاعتدال نے شریک کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس روایت کا راوی ثقہ نہیں ہے درآنحالیکہ احمد بن حنبل، ابو القاسم بغوی، طبری، ابن معین، وغیرہ نے معتبر قرار دیا ہے۔ اس حدیث کو سیوطی سے اللئالی نے ذکر کیا اور حاکم سے بھی مروی ہے۔

[2] کنز العمال ج ۵ / ۴۱

بند کرا دیا صرف علیؑ تھے جو حالت جنابت میں مسجد میں داخل ہو سکتے تھے اور انہیں کا دروازہ کھلا تھا اور مسجد کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اسی موقعے پر عمر بن خطاب نے کہا تھا:

"علیؑ کو تین ایسی خصوصیت حاصل تھی کہ اگر اس میں سے ایک بھی مجھے مل جاتی تو سرخ اونٹوں سے بہتر تھی: ۱. دختر رسولؐ انکی زوجہ تھیں ۲. مسجد رسولؐ میں انکی رہائش تھی جو نبیؐ پر حلال تھا وہی علیؑ پر۔ ۳. خیبر کے دن علمبردار علیؑ بنائے گئے۔"

اور ــــ ابن عمر سے روایت ہے کہ ــــ : جب آنحضرتؐ سے علیؑ کے دروازے کے کھلے رہنے کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا:

"میں خدا کا بندہ اور اس کے حکم کا بجا لانے والا ہوں جو حکم الٰہی ہوتا ہے انجام دیتا ہوں وحی کے علاوہ کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا۔"

۱۶. ہجرت سے قبل جب مہاجرین کے درمیان صیغۂ برادری پڑھا گیا تو علیؑ سے خود صیغۂ اخوت پڑھا اور فرمایا:

"تم میرے بھائی و وارث ہو، تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی صرف فرق اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

یہی صیغۂ برادری جب پانچ ماہ بعد انصار و مہاجرین کے درمیان

پڑھا گیا تو اس موقع پر بھی آپ نے علیؑ سے اپنا صیغۂ اخوت پڑھا جب کہ مرسل اعظم وعلیؑ بن ابی طالب دونوں مہاجرین میں تھے۔ متعدد مناسبتوں سے آپؐ نے علیؑ بن ابی طالبؑ کو اپنا بھائی بنایا اور قرار دیا۔

۱۷۔ سنہ ہجری تھی جب سرکار رسالتؐ حجۃ الوداع سے واپس ہوئے میدان غدیر کی سخت گرمی میں نماز ادا فرمائی اور ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد حاجیوں کے مختلف قبیلوں کے درمیان خطبہ دیا جس میں اپنے دنیا سے انتقال کی خبر بھی تھی، دو عظیم سرمایہ، خدا کی کتاب اور اپنی عترت کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی اور فرمایا کہ قرآن و عترت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے جو اس سے وابستہ رہے گا، گمراہ نہیں ہوگا۔ پھر علیؑ بن ابی طالب کا بازو پکڑ کے فرمایا:

"اے لوگو! کیا میں تمہارے نفسوں سے اولیٰ نہیں ہوں؟"

حاضرین نے کہا: اللہ کے رسولؐ! یقیناً آپ اولیٰ ہیں۔

حضرتؐ نے اپنے سوال کو مزید دہرایا اور حاضرین نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ دوبارہ اقرار لینے کے بعد حضرتؐ نے فرمایا:

"جس کا میں مولا ہوں علیؑ اس کے مولا ہیں۔ بار الٰہا! اس کو دوست رکھ جو علی کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علی کو دشمن رکھے، اس کی نصرت فرما جو علی کی مدد کرے اور اس کو ذلیل فرما جو علیؑ سے بیزار ہو، حق کو ادھر موڑ جدھر علی ہوں۔"

حضرتؐ کے ارشاد کے بعد عمر بن خطاب نے علیؑ بن ابی طالب سے

ملاقات کی اور کہا :

"علی ! مبارک ہو آپ مومن و مومنہ کے مولا قرار پائے "[1]

تفسیر رازی میں آیہ "یا ایہا الرسول بلّغ" کے ذیل میں آیا ہے کہ

عمر نے یہ کہا :

"آپ میرے اور مومن و مومنہ کے مولیٰ قرار پائے"۔

یہ وہ صحیح حدیثیں ہیں جس کو اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کر رہا ہوں اس سے زائد کی گنجائش اس رسالہ میں نہیں ہے ورنہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ احادیث کے ساتھ ساتھ آیاتِ قرآن بھی علی بن ابی طالب کی امامت وخلافت پر شیعوں نے پیش کی ہیں۔

آیات

ابن عباس کا بیان ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کی شان میں تین سو آیتیں نازل ہوئیں لیکن اہل سنّت کے یہاں صرف سو آیتیں ہیں جو آپؑ کی شان میں نازل ہوئیں ــــ اس جگہ صرف تین آیتوں کو پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ آیہ انّما ولیّکم اللّٰہ ورسولہ والّذین ...

"تمہارا ولی اللہ، رسولؐ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے نماز قائم کی اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دی۔"

---

[1] مسند حنبل ج ۴ ص ۲۸۱ . صواعق محرقہ ، تفسیر ثعلبی سے ملتی جلتی گیارہ عبارتیں نقل کی ہیں۔

یہ آیت علیؑ بن ابی طالب کے لئے نازل ہوئی جس وقت آپؑ نے رکوع کی

حالت میں اپنی انگوٹھی سائل کو دی تھی۔

یہ آیت علیؑ بن ابی طالب کے لئے خدا و رسولؐ خدا جیسی ولایت ثابت کرتی ہے۔ یہ آیت انہیں حدیثوں کی طرح ہے جس میں علیؑ بن ابی طالب کے لئے ولایت کا تذکرہ تھا۔

۲. آیۂ تطہیر — جس وقت آنحضرتؐ نے علیؑ بن ابی طالب اور آپکی زوجہ فاطمۂ زہراؑ اور دونوں بچے حضرات حسنینؑ کو چادر کے نیچے جمع کیا۔ اس وقت آیۂ تطہیر نازل ہوئی، جس میں حضرت احدیت نے رجس و کثافت کو آپ لوگوں سے دور رکھنے کا تذکرہ اور طہارت کا مژدہ سنایا۔ یہ وہی عصمت ہے جس کا امام کے لئے ہونا ضروری ہے۔

۳. آیۂ مباہلہ — آیۂ تطہیر میں جن اہل بیت کا تذکرہ گذر چکا ہے آنحضرتؐ نے ان ہی کو ساتھ لے کر نصارائے نجران سے مباہلہ کیا اور آیت کے مطابق علیؑ بن ابی طالب کو اپنا نفس قرار دیا۔

جب ہم نے طے کر لیا کہ "انتخاب" کے ذریعہ خلیفہ کی تعیین نہیں ہو سکتی تو ضروری ہے کہ آنحضرتؐ اپنے کسی صحابی کی خلافت کے لئے نص صادر فرمائیں اور بلاشبہہ ابوبکر ان میں سے نہیں ہیں کہ جن کے لئے نص وارد ہوئی ہو۔

نہ صرف ابوبکر بلکہ علیؑ بن ابی طالب کے علاوہ کوئی نہیں ہے جس کیلئے اس قدر آیت و روایت وارد ہوئی ہو۔ ہر آیت و روایت ایک دوسرے کی تفسیر و توجیہ کر رہی ہے اور صراحت سے بتا رہی ہے کہ علیؑ بن ابی طالب

آنحضرتؐ کے بعد

آپ کے ـــ خلیفہ

آپ کے ـــ وارث

آپ کے ـــ وصی

آپ کے ـــ بھائی

آپ کے ـــ بعد مومنین کے ولی ہیں اور ان کے نفسوں پر اولیٰ ہیں۔
ان کی وہی حیثیت ہے جو ہارون کی موسیٰ کے نزدیک تھی۔ صرف فرق اتنا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حق علیؑ ابن ابی طالب کے قدموں کی حرکت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے، حق اور علیؑ میں ہرگز جدائی نہیں ہو گی، وہ ہماری امت میں سب سے بڑے قاضی ہیں۔ ہمارے شہر علم کا دروازہ ہیں اور ہر رجس سے پاک و پاکیزہ ہیں۔

یہ وہ صفات ہیں جو سوائے امام معصومؑ خلیفۂ نبی جس کو خدا اور رسولؐ نے منتخب کیا ہو کسی اور کے لئے روا نہیں ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے بعد مومنین کا ولی و سرپرست ہو اور مومنین کی جان کا حاکم ہو اس کی حیثیت ایک عام سے مسلمان کی ہو اور دوسرے کی اطاعت خود اس پر واجب ہو ـــ ؟ قطعاً نہیں۔

لیکن جن لوگوں نے امامت کے موضوع کو عنوان قرار دیا۔ ان میں سے کچھ نے مذکورہ تمام الفاظ کی تاویل کی تاکہ اصحاب کرام کی شخصیت مجروح نہ ہونے پائے اور مخالفت نصّ پیغمبر اسلامؐ کا الزام بھی نہ آسکے۔

میں ان حضرات سے ــــ جنھوں نے ارشادات پیغمبرؐ کی تاویلیں کی ہیں ــــ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو صحابہ کی نیتوں میں کوئی شبہہ نہیں ہے اور ان کو مجتہد بھی سمجھتے ہیں تو مان لیجئے کہ ان مجتہدین نے نص رسول اکرمؐ کی مخالفت کی ہے اور آپ کے نزدیک مجتہدین کی خطائیں زیادہ قابل گرفت نہیں ہوتیں۔

بے شمار ایسے موارد ہیں جہاں صحابہ نے نص آنحضرتؐ کی مخالفت کی ہے۔ مثلاً آنحضرت کی مسلسل تاکید کے باوجود لشکر اسامہ میں شرکت نہیں کی۔ اس قدر پہلو تہی کی کہ آنحضرتؐ غضبناک ہوئے لیکن نہ جانا تھا نہ گئے یہاں تک کہ آنحضرت دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مثلاً ــــ عمر نے صلح حدیبیہ میں آنحضرتؐ پر اعتراض کیا۔

یا ــــ وقت آخر نوشتہ لکھنے سے آنحضرتؐ کو روک دیا، جس نوشتہ کے لئے حضرت نے فرمایا تھا کہ یہ وہ نوشتہ ہے جس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

میرے لئے اب دو ہی رخ ہے ــــ :

الف - احادیث رسولؐ اکرم کی صحیح و غلط توجیہ و تفسیر کر ڈالوں ــــ یا

ب - یہ مان لوں کہ اصحاب نے اپنی منشاء کی خاطر حدیث رسولؐ کو توڑ مروڑ دیا بلاشبہہ دوسرا رخ بحث علمی اور فکر مستقیم سے زیادہ قریب ہے۔

چونکہ ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ صحابہ نے خود حیات مرسل اعظمؐ میں نصوص کی مخالفت کی جو کسی اعتبار سے تاویل و توجیہ کے لائق نہیں تھی۔

جو لوگ ان صحابہ سے حسن ظن رکھتے ہیں وہ قطعاً" اس کو مخالفت پیغمبر اسلامؐ سے تعبیر نہیں کر سکتے بلکہ اس انداز کو مصلحت پر محول کریں گے چونکہ آنحضرتؐ حکم الٰہی شاورھم فی الامر کی روشنی میں اصحاب سے مشورہ کرتے تھے لہٰذا اصحاب اس کے عادی ہو چکے تھے کہ وہ ان امور میں بھی دخل اندازی کریں جو ذات رسالت سے مخصوص تھے۔

مزید براں یہ تاویل کرنے والے احادیث و آیات کی جو تاویل کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔

مثلاً یہی حدیث غدیر جو آخری نص ہے یا آیۂ "انما" یا حدیث "ولی کل مومن بعدی" مولیٰ و ولی کو دوست کے معنی میں پیش کیا ہے یہ توجیہ و تاویل حدیث غدیر کے لئے بالکل مخالف ہے کیونکہ اگر ارباب لغت نے مولیٰ و ولی کے معنی دوست اور مددگار کے لکھے ہیں تو اسی طرح "مالک تصرف" بھی ذکر کئے ہیں۔ اور الفاظ مشترکہ کے معنی قرینہ سے سمجھے جاتے ہیں۔ حدیث غدیر میں قرینہ حالیہ و لفظیہ یہی بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے "مالک تصرف" مراد لیا ہے۔

کیونکہ تمتماتے صحرا میں ایک لاکھ سے زائد حاجیوں کے درمیان مرسل اعظمؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا، کیا عقل سلیم اس کو تسلیم کرتی ہے کہ رسول اکرمؐ جیسا حکیم الٰہی ایسے آگ برستے ماحول میں صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ــــ علیؑ

مومنین کے ناصر و دوست ہیں!

نہیں! کوئی حکمت تھی جس کی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے اس ناقابل فراموش ماحول کو چنا تھا۔

اس شدید گرم ماحول میں حاضرین کو اپنے انتقال کی خبر دی، کتابِ خدا اور اپنی عترت سے تمسک کی تاکید کی، پھر علیؑ بن ابی طالب کے بازو پکڑے اور اتنا بلند کیا کہ سفیدی بغل نمودار ہو گئی اور لوگوں سے اقرار لیا:

"کیا میں تمہارے نفسوں پر ولی وحاکم نہیں ہوں؟"

آنحضرتؐ بغیر کسی حکمت کے یہ سوال نہیں فرما رہے تھے، اس تمہید کے بعد امت کو نتیجہ سے باخبر کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ نتیجہ یہ تھا:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

بلاشبہہ قرینۂ لفظیہ صراحت کر رہا ہے کہ جو منزلت آنحضرتؐ کو مومنین کے نفسوں پر حاصل تھی — علیؑ بن ابی طالب کو بھی وہی مرتبہ حاصل ہے۔

یہاں — مولیٰ — کے معنی

مالک تصرف اور اولی بالشئی کے ہیں اسی لئے غلام کے آقا کو مولیٰ کہا جاتا ہے، چونکہ اس کو اس پر حق تصرف و اولویت ہوتا ہے۔

یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ مولیٰ کے معنی صرف اولیٰ کے ہیں چونکہ پھر اعتراض کا موقع مل جائے گا کہ جس طرح "اولیٰ منہ" کا استعمال صحیح ہے لہٰذا "مولیٰ منہ" کا استعمال بھی صحیح ہے۔

لہٰذ مولا کے مجموعی معنی ہیں ــــــ "الاولیٰ بالشئ منہ" یعنی وہ شخص جو کسی چیز پر اولویت رکھتا ہو اس کو "مالک تصرّف" بھی کہتے ہیں۔

دوسری حدیث جس کی بعض افراد نے تاویل کی ہے وہ حضرتؐ کی سب سے پہلی نص ہے جس کے الفاظ ہیں: انَّ ھٰذ اخی و وصیّ وخلیفتی فیکم...

اس سے واضح اور صریح الفاظ میں کوئی نص نہیں ہو سکتی جس سے اپنے بعد کے خلیفہ و وصی کا تعارف کرایا جا سکے۔

اس کے برخلاف ابوبکر کی خلافت پر جو نص صادر ہوئی ہے اس کے الفاظ ہیں ــــــ : انی اموت علیکم عمر بن خطاب ــ "میں عمر بن خطابؓ کو تمہارا امیر بنا رہا ہوں جس کو عمر نے انکار کرتے ہوئے ابوبکر کے لئے نص بتایا جبکہ "امارت" اور "خلافت" کے درمیان کا فرق واضح ہے چونکہ امارت ممکن ہے لشکر یا کسی دوسرے موقع کے لئے رہی ہو لیکن خلافت وہ لفظ ہے جسے آنحضرت اور خود مسلمان "جانشین" کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے لہٰذا پیغمبر اسلامؐ نے فرمادیا کہ میری جانشینی کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک بارہ نفر قریش سے خلیفہ نہ بن جائیں۔[1]

جس طرح اس ارشاد میں قریش کے معنیٰ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تو دعوت ذوالعشیرہ والی روایت میں استعمال ہونے والی لفظ "خلیفتی"

---

[1] ھذ الامر لا ینقضی حتی یمضیٰ اثنا عشر خلیفۃ کلّھم من قریش

کے معنی و مقصود میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے جبکہ آنحضرتؐ نے ایک دن بھی کلمہ خلیفہ کو جانشین کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔

ابوبکر کی نص ـــــ اور آنحضرتؐ کی نص میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ابوبکر کی نص پر عمل کرتے ہوئے عمر کو خلیفہ بنا دیا گیا، کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جس سے ابوبکر کی نص کی تاویل ہوتی لیکن حضرت علیؑ کو خلیفہ نہ بنا کر پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت ہوئی وہ نص مسلمانوں کے سینے اور کتابوں کے صفحات پر بغیر عمل باقی رہ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کی محبت کا دم بھرنے والوں نے کلام پیغمبرؐ کی تاویل کی تاکہ صحابیت کا بھرم باقی رہ جائے۔ بہر حال اگر صحابہ مخالفت کلام پیغمبر اسلامؐ کی وجہ سے قابل مذمت قرار نہ پائیں تو خطاکار بہر حال کہے جائیں گے۔ اگرچہ خطا ان افراد کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔

صحابہ کو ان کے افعال کی وجہ سے کیا کہا جائے گا یا ان لوگوں کی کارستانیاں کیا ہیں مجھے اس سے سروکار نہیں، اتنا ضرور ہے ان لوگوں نے ان حدیثوں کی مخالفت کی جو صراحت سے خلافت علیؑ بن ابی طالب پر دلالت کر رہی تھیں، کیونکہ "وصیی د خلیفتی" جیسے لفظوں سے زیادہ واضح لفظ نہیں ہو سکتا تھا جس سے آنحضرتؐ لوگوں کو حضرت علیؑ کی اطاعت کا حکم صادر فرماتے۔

گزشتہ صفحات پر گیارہویں نمبر کی حدیث بھی خلافت علیؑ بن ابی طالب

پر صراحت سے دلالت کرتی ہے، جس میں حضرتؐ نے فرمایا تھا کہ:

ہر نبی کا وصی و وارث ہوتا ہے میرے وصی و وارث

علی بن ابی طالب ہیں۔

اس ارشاد نے یہ وضاحت کر دی کہ علیؑ بن ابی طالب تک زمین و جائداد کی میراث نہیں منتقل ہوئی تھی بلکہ نبوت کی وراثت و وصایت منتقل ہوئی تھی۔ کیونکہ شرعی اعتبار سے علی بن ابی طالب، چچا زاد بھائی تھے اور لڑکی کی موجودگی میں وہ مستحق میراث نہیں تھے۔

اور جو پیغمبر کی نبوت کا وارث ہوگا اس کے معنی ہیں وہ نبی کی طرح ولایت عامہ رکھتا ہے عوام پر واجب ہے کہ ایسے شخص کی اطاعت کریں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں وارث سے مراد "علم رسول" ہے تو یہ توجیہ غلط ہے کیونکہ علم تو سارے مسلمانوں کو میراث میں آنحضرت سے ملا تھا اور اگر "مخصوص علم" علی بن ابی طالب تک میراث میں منتقل تھا جو رسول اکرم کے خصوصیات میں تھا تو یہ خود ایک دلیل ہے کہ علیؑ آنحضرتؐ کے جانشین و خلیفہ تھے۔

اگر باقی حدیثیں علیحدہ علیحدہ خلافت علی بن ابی طالب پر نص نہ بھی ہوں تو مجموعی طور سے گزشتہ شواہد کو ضمیمہ کر کے نص جیسا مفہوم سامنے آتا ہے جسمیں کسی تاویل و توجیہ کی قطعی کوئی گنجائش نہیں یہ بھی اس اقرار کے بعد کہ خلیفہ کا انتخاب مسلمانوں کے ذریعہ صحیح نہیں تھا آنحضرتؐ کیلئے ضروری تھا کہ اپنے کسی صحابی کے لئے صراحت سے خلافت کا اعلان فرمائیں۔

سوال

اس جگہ ایک شبہہ رہ جاتا ہے جو ہمیشہ ارباب تحقیق کی گفتگو کا موضوع بنا رہا اور آج تک اس کی تکرار جاری ہے۔

وہ شبہہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات شیعوں کے بیان کے مطابق خلافت کی محکم دلیل ہیں تو کیوں خود علیؑ بن ابی طالب نے عوام کے سامنے اس کو بطور احتجاج پیش نہیں کیا یا آپ کے طرفداروں نے یا باقی مسلمانوں نے سقیفہ کے اجلاس میں اس کو بطور استدلال عنوان قرار نہیں دیا ؟

جواب

بلاشبہہ یہ ایک معقول اشکال ہے ۔ جواب دینے والوں نے متعدد جواب دئیے ہیں سب کا ذکر تطویل کا سبب ہوگا لیکن جو جواب مجھے پسند آیا اسے تحریر کر رہا ہوں تاکہ حقِ الٰہی سے عہدہ برآ ہو سکوں۔

جس وقت امیرالمومنینؑ نے یہ دیکھا کہ لوگوں نے ابوبکر کی بیعت کر لی تو آپ حالات کے دوراہے پر کھڑے تھے کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا جس کو اختیار کرتے :

الف ۔ اسلام کی حیات و بقاء کے لئے یا اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں ۔

ب ۔ یا اپنے حق کی بازیابی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ، امام علیؑ نے خود اپنے الفاظ میں اس موقعے کی ترجمانی فرمائی ہے : ــــــ

میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں آیا خالی ہاتھ حملہ کر دوں یا اس اندھیر پر صبر کروں لیکن اس نتیجہ تک پہنچا کر صبر کر لینا بہتر ہے۔[1]"

لہٰذا حضرتؑ نے اپنی خلافت کا مطالبہ نہیں فرمایا اور اگر حضرت اپنے حق کی خاطر قدرت و طاقت کو کام میں لاتے تو اسلام کی حیات کے لئے خطرہ اور فتنہ و فساد کے ابل پڑنے کا امکان تھا۔ اس موضوع پر تفصیلی روشنی چوتھی فصل میں ڈالوں گا۔

اگرچہ اصحاب علیؑ بن ابی طالب نے آپ کی بیعت کا مطالبہ کیا اور سقیفہ میں جو انصار تھے ان میں سے کل یا بعض نے علانیہ کہا کہ ہم صرف علیؑ کی بیعت کریں گے۔ لیکن یہ مطالبہ فضائے تاریخ میں گم ہو کر رہ گیا میں نے اس حقیقت کی طرف اسی کتاب میں متعدد جگہ اشارہ کیا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۳

دوسری فصل

تدبیرِ پیغمبر اسلام ؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بستر علالت پر ہیں اور اسی علالت میں آپ نے اس دار فانی کو وداع فرمایا۔ لیکن جاتے جاتے آپ کو اس کا خدشہ ہے کہ آپ کے بعد امت مسلمہ فتنہ و فساد کے بھنور میں پھنس جائیگی اور ساتھ ہی ساتھ جنگوں میں شکست خوردہ عرب آنحضرتؐ کے بعد آپ کے اہل بیت اور آپ کی قوم کے خلاف انتقام کی ٹھان چکے تھے وہ اس موقع کی تاک میں تھے کہ کیسے اپنی شکستوں کا بدلہ لیں۔

دوسری طرف منافقین خود انتقام کی کمین میں بیٹھے ہوئے تھے جن کے دلوں میں کچھ اور تھا اور زبان پر کچھ اور۔ غضب تو یہ تھا کہ یہ لوگ اصحابِ

رسولؐ شمار ہو رہے تھے۔

ان سب سے زیادہ خطرہ اسود عنسی اور مسیلمہ سے تھا جنھوں نے دعوتِ نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا اور اس کے طرفدار بھی خاصی تعداد میں ہو چکے تھے۔

آنحضرتؐ کو اس کا شدید ملال تھا کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مسلمانوں کو پھنسا ہوا چھوڑ کر جا رہے تھے۔

حدیث کے فقرے ہیں کہ آنحضرتؐ کی نگاہ میں وہ گھر تھے جن سے فتنے و فساد ابلنے والا تھا اسی طرح جس طرح پرنالے سے پانی گرتا ہے۔

ان پُرآشوب حالات کے باوجود اپنی علالت سے ایک دن قبل آنحضرتؐ نے جواں سال اُسامہ کی سرکردگی میں دور دراز علاقہ میں پرہیجان لشکر کے روانہ کرنے کا حکم صادر فرمایا اور خود پرچم اسلام کو اُسامہ کے سپرد فرمایا اور مہاجر و انصار کی نمایاں فردوں مثلاً ابوبکر و عمر و عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ، سعد بن ابی وقاص، اسید بن حضیر، بشیر بن سعد اور ان جیسوں کو ساتھ جانے کا حکم دیا[1]۔

---

[1] طبقات بن سعد ج ۴ ص ۴۶، ص ۱۳۶ - تہذیب ابن عساکر ج ۲ ص ۳۹۱ و ج ۳ ص ۲۱۵ کنز العمال ج ۵ ص ۳۱۲، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۷۲، تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۹۳ اور ابی الحدید نے ج ۲ ص ۱۷۲ پر لکھا ہے کہ آنحضرت نے ابوبکر کو لشکر اسامہ کیساتھ جانے کا حکم فرمایا تھا۔ مؤخرین میں محمد حسین ہیکل نے "حیاۃ محمد" میں بھی اس کی تائید کی ہے۔ میں نے کہیں نہیں

روانگی کیوں؟

اس لشکر کے روانہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ شام کے علاقہ بلقاء کے لوگوں نے اسامہ کے باپ زید کو قتل کر دیا تھا۔

آنحضرت نے اس لشکر کے ساتھ جانے کی شدید تاکید کی اور نہ جانیوالوں پر لعنت و نفرین کی اور جب لوگوں نے جواں سال اسامہ کی سرکردگی میں جانے سے چون وچرا کی تو آپؐ نے غضبناک ہوکر فرمایا:

"اگر تم لوگوں کو اسامہ کی سرداری پر اس وقت اعتراض ہے، تو تم لوگوں نے اس کے باپ زید کی قیادت و سرداری پر بھی اعتراض کیا تھا۔

خدا کی قسم جس طرح اسامہ سرداری کا اہل ہے اسی طرح اس کا باپ بھی مستحق و اہل تھا۔

۲۔ انسان اگر اس واقعہ پر غور و خوض کرے تو اس کو انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر ان حالات میں آنحضرتؐ نے لشکرِ اسلام کی باگ ڈور

دیکھا کہ کسی نے اشارۃً یا صراحۃً یہ لکھا ہو کہ ابو بکر لشکر اسامہ سے خارج تھے۔ کچھ ایسے مورخین ہیں جنھوں نے کسی کا نام نہیں لکھا صرف یہ لکھا کہ سر برآوردہ شخصیتوں کو آنحضرت نے روانہ کیا۔ لیکن بعض اختلافی اور ضدی قسم کے قلمکاروں نے بغیر کسی ثبوت کے یہ لکھا کہ ابو بکر جزو لشکر اسامہ نہیں تھے۔

ایک بیس۲۰ سالہ نوجوان کے سپرد فرمائی۔

جبکہ اس نے اس کے پہلے کوئی سرداری نہیں کی ہے درانحالیکہ قبیلوں کی نمایاں فردیں موجود تھیں اور آنحضرتؐ کے اصحاب بھی اپنے تئیں خود کو اسامہ جیسے نوجوان سے قدر و منزلت میں زیادہ سمجھتے تھے

اس لشکر کی ذمہ داری بھی شدید تھی چونکہ جس علاقہ میں جنگ کے لئے بھیجا جارہا تھا وہ مرکز اسلام مدینہ سے بہت دور واقع تھا اور دشمن بھی قوی تھا۔

جن حالات میں آنحضرتؐ نے اسامہ کو سردار لشکر قرار دیا۔ اس وقت اکابر مسلمین موجود تھے جو پہلے بڑے بڑے عہدوں کے لئے اپنے کو نامزد بھی کر چکے تھے۔

لیکن آنحضرت کی شدید تاکید اور لعن و نفرین کے باوجود مسلمان جنگ پر جانے سے پہلو تہی کرتے رہے۔

ضروری ہے اس جگہ اس حقیقت سے آشنا ہو جائیں کہ لشکر کی روانگی حضرتؐ کی علالت سے تھوڑا قبل انجام پائی یا علالت کی ابتداء میں چونکہ کم از کم چودہ دن حضرتؐ صاحب فراش رہے۔ اس پورے عرصہ میں مسلمان جنگ پر جانے سے کتراتے رہے۔ درآنحالیکہ خود اسامہ مقام جرف پر جو مدینہ سے ایک فرسخ کے فاصلہ پر تھا، لشکر اسلام کا انتظار کرتے رہے۔ ادھر آنحضرتؐ کی علالت سے متعلق مختلف افواہیں گشت کر رہی تھیں بالآخر اسامہ مدینہ واپس ہوئے اور پرچم اسلام کو آنحضرتؐ کے بیت الشرف پر

نصب کر دیا۔ لیکن حضرتؐ ہر بار لشکر اسلام اور مسلمانوں کو شام کی چڑھائی پر جانے کی تاکید فرماتے رہے۔

آخری دن اسامہ دوبار مدینہ واپس ہوئے، آنحضرتؐ نے جس کے بعد فرمایا: کل خدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ ۔ اسامہ نے حضرتؐ کے حکم کے مطابق آپ سے رخصت لی اور جنگ کے لئے نکل پڑے لیکن پھر عمر اور ابو عبیدہ کے ساتھ واپس ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا وقتِ آخر ہے ۔ اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد آپؐ فردوس اعلیٰ میں جا پہنچے۔

کیا وجہ تھی جو مسلمان صریحاً حکم پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کرتے رہے جبکہ آنحضرتؐ بار بار روانگی کی تاکید فرماتے رہے نہ ذرّہ برابر مسلمانوں کو آپ سے حیا آئی نہ خوفِ خدا و رسولؐ رہا بلکہ اپنے کو خدا و رسولؐ کی نفرین کا مستحق قرار دیا ۔

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو نحیف و ناتواں سمجھ کر سرکشی پر تُلے تھے یا کوئی اور راز تھا؟

۳۔ مسلمانوں کو اسامہ کی سرداری پر اعتراض تھا جس کا شکوہ آنحضرتؐ سے کیا تھا جبکہ حضرت نے اس طرح کی چہ می گوئیوں سے منع بھی فرمایا لیکن مسلمان اپنی ناراضگی پر جمے رہے۔ اگر یہ اعتراض کرنے والے اسلامی تعلیمات میں پلے ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے چونکہ انہیں اس کا علم ہوتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد وحی کے مطابق ہوتا ہے اور عوام کو رسول اکرمؐ کے ارشاد پر چون و چرا کا حق نہیں ہے۔

۴۔ جب پیغمبر اسلامؐ کو علم تھا کہ وقت انتقال قریب ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کے بعد شب تاریک کی طرح فتنہ و فساد کا اندھیرا ماحول پر چھائیگا پھر کیوں لشکر اسلام کو زعمائے مسلمین کے ساتھ اس قدر دور روانہ کر رہے تھے یقیناً اس میں کوئی راز تھا جو مسلمانوں کی فکر سے بالاتر ہے۔ کیا ان باتوں کا کوئی معقول جواب ہے جس سے ایک آزاد ضمیر مطمئن ہو سکے۔ جبکہ یہ اپنی جگہ طے ہے کہ نبی اعظمؐ جو اقدام فرماتے تھے وہ وحی الٰہی کی روشنی میں ہوتا تھا۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ فرض کریں کہ حضرت کی خواہش تھی ـــــــ

ا ۔ مسلمان ذہنی اور عملی طور سے عادی ہو جائے کہ امامت و امارت و ولایت کے لئے باشہرت اور سن رسیدہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا لہٰذا یہی وجہ تھی کہ اسامہ کی قابلیت کے اظہار کے لئے آنحضرتؐ نے قسم اور لاؔم کے ذریعہ تاکید فرمائی۔

یہیں سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے کوئی صریح نص نہیں تھی تو بھی اتنا بہر حال طے ہے کہ آپ میں جانشینی رسول اکرمؐ کی قابلیت تیس سال کے سن میں ان لوگوں کے بہ نسبت بہر حال پائی جا رہی تھی جو آپ سے سن و سال میں بڑے اور نمایاں تھے۔

یا حضرت کی مراد یہ تھی ـــــــ

جو لوگ خلافت کے خواہشمند تھے ان کو اپنی وفات کے

وقت مدینہ سے دور بھیج دیں تاکہ جس کو خلافت کے لئے منصوب کیا ہے اس کے لئے رخنہ ایجاد نہ ہو سکے۔

یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو اپنے اہل بیت بالخصوص علیؑ کے لئے بہت خوف تھا لہٰذا اپنی عترت کیلئے فرما چکے کہ ان کے بعد ظلم وستم کا نشانہ بنائی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے لشکر اسامہ میں ہر شخص کو شامل کر دیا تھا جس میں خلافت کی ہوس پائی جا رہی تھی۔ اس کے برخلاف علیؑ اور آپؑ کے طرفداروں میں سے کسی ایک کو بھی ـــ جو بیعت ابوبکر کے مخالف تھے ـــ لشکر اسامہ میں جانے کی تاکید نہیں فرمائی درآنحالیکہ یہ لوگ کوئی گمنام نہیں تھے۔

یہ وہ راز ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اسامہ کے ساتھ جانے میں پہلو تہی کی اور یہی نہیں بلکہ فوجی چھاؤنی پہ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کی افواہ پھیلادی۔

یہ ٹولہ اپنے دل کے راز کو تو آشکار کر نہیں سکتا تھا لہٰذا اسامہ کی کمسنی کو بہانہ بنایا نتیجہ میں فرمان رسول کی توہین اور آپ کے حکم سے سرپیچی کے مرتکب ہوئے۔

آنحضرت کا مقصد اس فوج کشی سے یہی تھا کہ مدینہ خلافت علیؑ کے مخالفین سے پاک ہو جائے۔ چونکہ آپ پر واضح ہو گیا تھا کہ مسلمان خلافت علیؑ سے متعلق آپ کے ارشادات پر عمل نہیں کریں گے چونکہ تاکید

شدید کے باوجود لشکر اسامہ میں شامل نہ ہوئے۔

اور اگر لشکر اسامہ کی سرکردگی میں چلا گیا ہوتا تو اس کی واپسی تک اقتدار حضرت علیؑ تک منتقل ہو چکا ہوتا اور مخالفین کے پاس سوائے تسلیم ہونے کے کوئی چارہ رہ نہیں جاتا۔ یا حضرتؐ کی مراد یہ تھی کہ —

جو افراد خلافت کے لئے زیادہ آرزو مند ہیں خود ان پر اور ملت اسلامیہ پر آشکار ہو جائے کہ جو ایک عارضی جنگ میں میری تاکید شدید کے باوجود اسامہ جیسے نوجوان کی قیادت کو قبول نہ کرے وہ کیونکر خود نبوت کا جانشین ہو کر مسلمانوں اور مومنوں کی سرپرستی و نظارت کر سکتا ہے۔

بہرحال لشکر اسامہ کی روانگی کی وجہ اس کے علاوہ کوئی اور سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرتؐ کا مقصد یہ تھا کہ خلافت علوی کو استحکام بخشیں اور یہ ساری توجیہ بھی اس فرض پر ہے کہ

امام علیؑ کی خلافت پر پہلے سے نص موجود تھی

آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ کچھ لوگوں پر علیؑ کی امامت شاق ہے اس کے علاوہ خود واقعۂ اسامہ میں ایسے شواہد ہیں جو اس توجیہ و تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت علیؑ اور آپؑ کے شیعوں کا لشکر اسامہ میں شامل نہ ہونا۔

بہرحال مسلمانوں نے مخالفت مرسل اعظمؐ کر کے آپؐ کے اقدام کو عملی جامہ پہننے نہ دیا لیکن یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے جو صفحہ دہر پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئی۔

کسی بھی مؤرخ کے لئے زیبا نہیں ہے کہ وہ لشکر اسامہ میں اصحاب کے شامل نہ ہونے کی وجہ ان کی کم سنی کو قرار دے کیونکہ یہ ایک عذر تھا جس سے وہ اپنے دل کے بھید کو چھپانا چاہتے تھے جس کی خبر آنحضرت کو تھی۔

اصحاب اگر اسامہ کی کم سنی کی وجہ سے نہیں گئے تو پھر قضیہ خلافت کے تمام ہو جانے کے بعد کیوں گئے، کیا مسلمانوں کے لئے ابوبکر کی اطاعت پیغمبر اسلامؐ سے بڑھ کر تھی؟ — اور یہی نہیں عمر جب تک زندہ رہے اسامہ کو "امیر لشکر" کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ اس خطاب سے مخاطب کرنا خود دلیل ہے کہ انہیں امیر لشکر تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔

عذر گناہ بدتر از گناہ

یہ عذر کرنا کہ اصحاب کے لئے فراق پیغمبر اسلامؐ شاق تھا لہذا لشکر اسامہ میں شامل نہیں ہوئے قطعاً قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اگر حقیقتاً آپ سے اُنس و محبت ہوتی تو حتماً لشکر میں جا ملتے کیونکہ نہ جانے کا حضرتؐ کو شدید قلبی ملال رہا۔

اگر یہ افراد چلے گئے ہوتے اور ایک سوار کے ذریعہ برابر پیغمبر اسلامؐ کے حالات معلوم کرتے رہتے تو اس نافرمانی سے کہیں بہتر تھا۔ آنحضرت کی اطاعت اگر ہو گئی ہوتی تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی بھلائی ہوتی، تاریخ کا رخ ہی آج کچھ اور ہوتا جو ہمارے

وہم وگمان سے باہر ہے - قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے - "اگران بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن ان لوگوں نے انبیاء کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے کرتوت کے عوض میں عذاب میں جکڑ لیا۔"[1]

اگر لشکر اسامہ کے ساتھ اصحاب چلے گئے ہوتے تو وہ اختلافات، جنگیں، خونین معرکے رونما ہوتے جس نے اسلام کے وقار کو دھچکا پہنچایا اس کی ہیبت کو مجروح کیا، لباس اسلام کو تار تار کر دیا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آج اسلام اسی طرح غریب و بے سہارا ہوگیا جیسا روز اوّل تھا

آنحضرتؐ نے اپنے بعد رونما ہونے والے اختلاف کے سدباب کیلئے کیا مدبرانہ وحکیمانہ اقدام فرمایا تھا - اے کاش آپ کو اس کا موقع دیدیا گیا ہوتا لیکن سچ ہے جس کی اطاعت وفرمانبرداری نہ ہو اس کا حکم کیا حقیقت رکھتا ہے.

نوشتۂ نجات

جب مسلمان اسامہ کے ساتھ شام کے لئے روانہ نہ ہوئے تو حضرتؐ بیماری کے ہجوم کے باوجود منبر پر تشریف لائے نہ قدم اٹھانے کی طاقت تھی اور نہ گفتگو کا یارا، رومال پیشانی پر بندھا تھا اسی حالت میں مسلمانوں

---

[1] اعراف/۹۶

کی سرزنش فرمائی کہ تاکید کے باوجود لشکر اسامہ کے ہمراہ روانہ نہیں ہوئے۔
لیکن حضرت نے اس سرزنش کے بعد یہ محسوس کر لیا کہ مجمع پر آپ کے اعتراض
و سرزنش کا کوئی اثر نہیں ہے۔

اگرچہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے کہ اصحاب نے آنحضرتؐ کی
نافرمانی کی آپ کے غضب و نفرین کی کوئی پروا نہیں کی۔ جبکہ آپ کی پوری
کوشش یہ تھی کہ آپ کا حکم مانا جائے اور مسلمان شام کے لئے نکل پڑیں لیکن
ہر طرح کی تاکید بے اثر رہی۔

مسلمانوں کے اس انداز نے پیغمبر اسلامؐ کو مجبور کر دیا کہ وہ خلافت
علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے استحکام کے لئے کوئی دوسرا مناسب و
مفید قدم اٹھائیں، کیونکہ یہ بات آپ پر پورے طور سے عیاں ہو چکی تھی کہ حضرت
علیؑ کی امامت وخلافت کی مخالفت پر مسلمان کمر بستہ ہو چکے ہیں جب آپ کی
حیات میں مسلمانوں کا یہ عالم ہے تو آپ کی وفات کے بعد کا انداز مہر نیم
روز کی طرح واضح تھا۔

لہٰذا پیغمبر اسلامؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ کوئی ایسی تحریر چھوڑ جائیں
جس سے بعد کا اختلاف برطرف ہو سکے چونکہ نوشتہ ہر طرح کی تاویل اور
چون وچرا سے محفوظ ہوتا ہے زبانی باتیں صرف سینہ بہ سینہ چلتی رہتی ہیں جس
میں تحریف و تصرف کا امکان رہتا ہے لہٰذا اسی مصلحت کے پیش نظر فرمایا:

"کاغذ و قلم لاؤ تاکہ تمہارے لئے ایسی تحریر لکھ دوں
جس کے بعد گمراہ نہ ہو گے۔"

کس قدر عظیم تحریر تھی ؟

جس کے بعد لوگ ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہوتے ؟

کیا نعمت عظیم تھی یہ تحریر!

خدا کی قسم کیا پیغمبر اسلامؐ نے ایسی تحریر کے لئے فرمایا تھا ؟ بلاشبہ آنحضرتؐ نے یہ فرمایا تھا۔ پنجشنبہ کا دن تھا جب حضرت پر مرض کی شدت ہوئی بیت الشرف میں عمر کچھ لوگوں کے ساتھ موجود تھے جس وقت حضرت نے فرمایا :

"ھلموا اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بعدی"

کتنا حسین موقع تھا حاضرین کے لئے کہ وہ فوراً قلم و کاغذ دیدیتے تاکہ آنحضرتؐ وہ لکھ دیتے جس سے خود ان لوگوں کو فائدہ ہوتا اور رہتی دنیا تک نسلیں فائدہ اٹھاتیں۔

اس نوشتہ مرسل اعظمؐ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں تھی، مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ اس عظیم نعمت سے بہرہ مند ہوتے اور فوراً حضرتؐ کے مطالبہ پر لبیک کہتے تاکہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہدایت ابدی سے سرشار رہتے۔

کیا مانع ہوا کہ مسلمانوں نے اس عظیم نعمت سے استفادہ نہیں کیا؟ یہی نہیں کہ عمر بن خطاب نے آپ کو لکھنے سے روکا بلکہ آنحضرتؐ کے حکیمانہ اقدام کو یہ کہکر ناکام بنادیا کہ ——

"ان پر مرض کا غلبہ ہے یہ ہذیان بک رہے ہیں ہمارے

پاس قرآن ہے وہی ہم لوگوں کے لئے کافی ہے۔

عمر کے اس بیان سے حاضرین میں اختلاف ہو گیا کچھ کہتے تھے فوراً حضرت کو کاغذ دیدو تاکہ وہ لکھ جائیں جس کے بعد کوئی گمراہ نہ ہو سکے —— اور کچھ عمر کے قول پر جمے رہے۔

کیا آپ کے خیال میں اس اختلاف کے بعد بھی آنحضرتؐ کو لکھ دینا چاہیے تھا جبکہ ہذیان کا الزام لگایا جا چکا ہو —— ؟

قطعاً نہیں چونکہ حضرت وحی کے پابند تھے کیونکہ جب تحریر سے قبل اس قدر شدید اختلاف پیدا ہو گیا اور حضرتؐ پر ہذیان جیسی کاری ضرب لگائی گئی تو کیا پتہ اس نوشتہ کے وجود میں آنے کے بعد لوگ ہدایت پاتے یا مزید گمراہ ہو جاتے۔

لہٰذا اس وقت آنحضرتؐ کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ حاضرین کو جھڑکتے ہوئے انکی غلطیوں سے متنبہ فرمائیں اور اپنی بزم سے نکال دیں، لہٰذا یہی ہوا، حضرتؐ نے فرمایا:

"قوموا ولا ینبغی عند نبی نزاع"

واقعۂ قرطاس اس طرح ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات پر نقش ہو گیا۔ درحقیقت یہ عظیم حادثہ تھا جو ہر قسم کی گمراہی کا باعث ہوا اور نہ جانے بعد میں کتنی گمراہیاں مزید رونما ہوں گی۔

حبر الامت جناب ابن عباسؓ جس وقت حیات مرسل اعظمؐ کے

اس واقعہ کو یاد کرتے تھے اس قدر گریہ فرماتے تھے کہ زمین آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی، اور اسی حالت میں کہتے تھے :

"ان الرزیۃ کل الرزیۃ ماحال بین رسول اللہ

وبین ان یکتب لھم ذلک الکتاب"۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ لوگوں نے آنحضرتؐ کو نوشتۂ نجات لکھنے کی اجازت نہیں دی۔

سوچنے کی جگہ ہے کیا راز تھا کہ عمر نے آنحضرتؐ پر نعوذ باللہ ہذیان کی تہمت لگائی۔

عمر کو پیغمبر اسلامؐ کی تحریر سے کیا نقصان پہنچ رہا تھا جو انہوں نے اس تحریر کو لکھنے نہ دیا جو صبح قیامت تک گمراہی سے بچانے والی تھی، کیا مسلمانوں کا گمراہی سے بچنا عمر کو پسند نہیں تھا ؟

یا درحقیقت عمر کا یہ خیال تھا کہ نبی ہذیان معاذ اللہ بک رہے ہیں؟ لیکن یہ عقیدہ تو اسی کا ہوسکتا ہے جو حقیقت پیغمبر اسلامؐ سے بے خبر ہو کیونکہ قرآن ایسے عقیدے والوں کو مشرک سمجھتا ہے اور عمر کے لئے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ جس وقت ابوبکر خلافت کے لئے وصیت کر رہے تھے تو عمر نے کیوں نہیں کہا کہ ہذیان بک رہے ہیں درآنحالیکہ ابوبکر وہ مرتبہ نہیں رکھتے تھے جو آنحضرت کا تھا درآنحالیکہ جس وقت خلافت کا فرمان لکھا جارہا تھا ابوبکر پر بے ہوشی بھی طاری ہوگئی تھی۔ عثمان نے اس خوف

سے کہ کہیں تحریر سے پہلے ابوبکر مر نہ جائیں اپنی طرف سے عمر کا نام جانشینی کیلئے لکھ دیا جب ابوبکر کو ہوش آیا تو اسی عثمان کی تحریر پر دستخط کر دیا۔

عمر نے آنحضرتؐ کو تحریر کرنے نہیں دیا کیا اس کی اور کوئی وجہ ہے؟

میں اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ نہیں کر سکتا کہ عمر پہلے سے واقف تھے کہ تحریر کے ذریعہ مرسل اعظمؐ خلافت علی بن ابی طالبؑ کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں، عمر کو اس کا اندازہ واحساس تھا چونکہ غدیر کے دن حضرتؐ نے جب قرآن و عترت کا تذکرہ کیا تھا تو فرمایا تھا کہ ــــ اگر قرآن و عترت کی اتباع کرو گے تو گمراہ نہیں ہو گے یہ دونوں حوض کوثر تک ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

یا حضرتؐ کے یہ فقرات تھے:

"اگر تم ان سے وابستہ رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔"

پیغمبر اسلامؐ کے اس جملہ "لا تضلّوا بعدہ ابداً" سے عمر سمجھ گئے کہ آنحضرتؐ کیا لکھنا چاہتے ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ عمر نے جب سمجھ لیا کہ پیغمبر اسلامؐ کا مقصد یہ ہے کہ قرآن و عترت کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیں تو عمر نے فوراً آنحضرتؐ کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

حسبنا کتاب اللّٰہ

ورنہ جب پیغمبر اسلامؐ کو عمر نے حواس باختہ بنا دیا اس کے بعد حسبنا کتاب اللہ کہنا بے معنی تھا۔

لہٰذا عمر اور ان کے ہم خیال مسلمانوں نے اس لئے آنحضرتؐ کو تحریر لکھنے سے روکا چونکہ وہ تحریر حضرت علیؑ کی خلافت کے لئے ہوتی۔ عمر کے لئے یہ موقع خلافتِ ابوبکر کو استحکام دینے کے لئے بہت مناسب تھا چونکہ وہ بہت دنوں سے اس کو کامیاب بنانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔

ہم عمر کی سازشوں کا ابھی مطالعہ کریں گے جو انہوں نے خلافت ابوبکر کو کامیاب بنانے کے لئے کی ہیں[1]

یہ عمر تھے جنھوں نے سقیفہ کے بعد ابوبکر کو اقتدار تک پہنچایا ورنہ تنہا ابوبکر کے بس کی بات نہیں تھی۔

عمر تھے جنھوں نے زبیر کی تلوار توڑ دی اور اس ٹوٹی ہوئی تلوار سے مقداد کے سینہ پر مارا اور ٹھوکروں سے سعد بن عبادہ کو نیم جان کردیا اور کہا:

۱۔ اس کو قتل کردو۔ یہی فتنہ ساز ہے۔

۲۔ حباب بن منذر کی ناک توڑ دی۔

۳۔ خانۂ سیدۂ طاہرہ میں جن لوگوں نے پناہ لی تھی انہیں دھمکایا۔

◆ عمر تھے جنھوں نے سقیفہ سے نکلنے کے بعد کھجور کی چھڑی ہاتھ میں لی اور لوگوں کو بیعت کی طرف ھنکا رہے تھے[2]

---

[1] ابی الحدید ج ا ص۵۸

[2] کنز العمال ج ۳ حدیث ۲۳۴۶ — ۲۳۶۳

ایک مؤرخ کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کا انکار کر دے کہ عمر نے خلافت علی ابن ابی طالب کے خلاف سازش کی ـــ اور آپؑ کی خلافت

عملی جامہ نہ پہننے پائے اس کے لئے بے حد کوشش کی۔

اور یہی نہیں بلکہ جو لوگ عمر کے ہم خیال و مددگار تھے مثلاً ابوبکر، ابوعبیدہ، سالم مولی حذیفہ، معاذ بن جبل وغیرہ۔ انہوں نے بھی خلافت علی بن ابی طالبؑ کے خلاف سازشیں کی۔

اسی طرح علی بن ابی طالب علیہ السلام کے لئے بھی واضح ہے کہ آپ کا ان لوگوں کی طرف میلان نہیں تھا جس کا اظہار حضرت کی ہر گفتگو و ملاقات میں محسوس کیا جا رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ آپ نے ابوبکر کی بیعت کی اور نہ خلفائے ثلاثہ کے زمانوں میں ہونے والی جنگوں میں حصہ لیا۔ جبکہ آپ جنگ کے ماہر اور لشکر اسلامی کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھے۔

عمر کے لئے حضرت علی کہتے تھے:۔

"ابوبکر کی خلافت کو اس لئے مضبوط بنایا تھا کہ ایک دن وہ خود خلیفہ بننے والے تھے"۔

حضرت نے خود عمر سے کہا:

"ناقۂ خلافت کو تھوڑا آج دوہ لو آج خلافت ابوبکر کے لئے سازگار کرو کل تم تک پہنچ جائے گی"[1]

---

[1] السیاسۃ والامامۃ۔ باب امامۃ ابی بکر۔ ابی الحدید ج ۲ ص ۵

حضرت کا ارشاد عمر کے لئے حرف بہ حرف صحیح ہو گیا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ عمر کے دل میں کس قدر بغض و کینہ تھا۔ اس کی شہادت ابن عباس اور اور خود عمر کے مکالمہ سے ہوتی ہے۔

خود اس واقعہ کے راوی ابن عباس ہیں وہ کہتے ہیں:

عمر نے کہا — تم جانتے ہو کیوں قریش نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے بعد تم لوگوں کا ساتھ نہیں دیا؟

ابن عباس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا — لہذا ٹالتے ہوئے کہا — تم ہی بتاؤ۔

عمر — وجہ یہ تھی کہ لوگ پسند نہیں کر رہے تھے کہ خلافت و نبوت دونوں تمہارے خاندان میں جمع ہو جائے تاکہ تم لوگ فخر کر سکو لہٰذا قریش نے اپنا سر اونچا کرنے کے لئے خلافت کو تم سے چھین لیا صحیح کیا اور کامیاب بھی ہوئے۔

ابن عباس — اگر آپ کے غضب سے امان ہو تو کچھ میں بھی کہوں۔

کہو کہو — عمر

یہ جو تم نے کہا کہ قریش نے خلافت کو اپنے لئے منتخب کیا۔ اگر یہ انتخاب خدا کی طرف سے تھا تو بہت عمدہ کسی کو حق نہیں کہ اس اس خلافت کو قریش سے چھینے یا ان سے حسد کرے۔ اور یہ جو تم

۱؎ تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۱ ابن اثیر ج ۳ ص ۳۱ ابی الحدید ج ۲ ص ۱۸

نے کہا کہ قریش کو یہ نہیں بھایا کہ خلافت و نبوت دونوں ہم بنی ہاشم میں رہے تو خدا نے ایسے افراد کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے:

"ذٰلک بانہم کرھوا ما انزل اللّٰہ فاحبط اعمالھم"

خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اس کو ناپسند کیا تو خدا نے ان کی کارستانیوں کو اکارت کر دیا۔ (محمد/۹)

عمر نے جل کر کہا —— ابن عباس تمہاری وہ، وہ باتیں مجھ تک پہنچی ہیں کہ اگر اس وقت چھیڑ دوں تو تم میری نظر میں گر جاؤ گے۔

ابن عباس —— اگر میری کہی ہوئی باتیں حق میں تو اس کے ظاہر ہونے سے میری توہین نہیں ہو گی اور اگر غلط ہے تو خدا مجھے بچائے۔

عمر —— مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم نے کہا ہے کہ خلافت کو حسد اور ظلم سے چھینا ہے۔ سب پر واضح ہے کہ ظلم سے قریش تک پہنچی ہے یا نہیں اور تمہارا یہ کہنا کہ حسد کی وجہ سے چھین لیا تو یہ بھی غلط ہے۔

آدمؑ سے ابلیس نے حسد کیا، ہم لوگ اولاد محسود ہیں ——

اے بنی ہاشم —— خدا کی قسم تمہارے دل کبھی صاف نہیں رہے، ہمیشہ کینہ و حسد بھرا رہا ——

جس پر ابن عباس نے کہا —— ٹھہرو ٹھہرو کیا کہہ رہے ہو جن دلوں کو خدا نے رجس و کثافت سے پاک و پاکیزہ بنایا اس کو حسد و کینہ سے نسبت نہ دو —— کیونکہ —— مرسل اعظمؐ —— بھی بنی ہاشم میں ہیں۔

جس پر عمر نے جھنجھلا کر کہا —— جاؤ یہاں سے۔

میں نے اس مکالمہ کو اس لئے لکھ دیا چونکہ اس سے بہت سے حقائق واضح ہو جائیں گے۔

الف۔ طرفین کے درمیان چھپی ہوئی عداوت کی چنگاری شعلہ ور ہو رہی تھی۔ میں اسی دشمنی کو آشکار کرنا چاہ رہا تھا جو اس مکالمہ کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

ب۔ قریش متفق تھے کہ خلافت اہل بیت رسالت تک نہ پہنچے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نبوت کے افتخار نے قریش کی عظمت و بزرگی کو مجروح کیا تھا لہٰذا انہیں قطعاً گوارہ نہیں تھا کہ نبوت و خلافت پھر بنی ہاشم سے مخصوص ہو قریش کے اس اقدام کو ابن عباس نے "حسد و ظلم" سے تعبیر کیا۔ عمر نے بنی ہاشم کے اس افتخار کو دوبار دہرایا۔ اس سے خود ان کے نہاں خانۂ دل کے اسرار کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ج۔ امامت کی تفویض کا اختیار حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کو ہے لہٰذا اس کی مرضی تھی کہ اہل بیت عترت خلیفہ قرار پائیں اس کا ربط قریش کی پسندیگی اور ناپسندیدگی سے نہیں ہے۔

د۔ یہ بات ہر شخص پر واضح ہے کہ خلافت سے آل محمد کو محروم کر کے ان پر ظلم کیا گیا۔ ابن عباس نہیں چاہتے تھے کہ عمر غضبناک ہوں لیکن اس رعایت کے باوجود انہیں عمر سے یہ اظہار کر دینا پڑا کہ ظلم اور حسد کی وجہ سے آل محمد کو محروم کیا گیا ہے۔

عمر نے بھی ابن عباس کے نظریہ کو رد نہیں کیا بلکہ غضب میں آکر بنی ہاشم کو برا بھلا کہا اور ابن عباس کو اپنے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔

عمر کا یہ انداز خود اس کا ثبوت ہے کہ ان کے پاس ابن عباس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ان باتوں کے تحریر کرنے کا مقصد یہی تھا کہ یہ واضح ہو جائے کہ عمر نے نبی معصوم کو خبط الحواس کہکر ان کی شان میں جو جسارت کی یا "حسبنا کتاب اللّٰہ" کے دعوے سے پیغمبر اسلامؐ کی جو مخالفت کی ہے یہ کوئی نئی و عجیب و غریب بات نہیں ہے چونکہ وہ یہ ٹھان چکے تھے کہ خلافت حضرت علیؑ کو نہ ملے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ علی بن ابی طالبؑ اور عمر کے درمیان تعلقات بڑی حد تک کشیدہ تھے تاریخ کے بس کی بات نہیں کہ اس حقیقت پر ملمّع کر سکے۔

بعض نے عمر کے اقدام کی یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ حکم پیغمبرؐ "امر وجوبی" کے منزل میں نہیں تھا ـــــ یہ توجیہ بالکل لچر اور عقل میں آنے والی نہیں ہے کیونکہ عمر نے یہ کہاں سے سمجھا کہ امر پیغمبرؐ اسلام یعنی قلم و کاغذ دینا ضروری نہیں ہے۔

کیا اس تحریر کے حکم شرعی ہونے میں کوئی شبہ ہے جو قیامت تک لوگوں کو گمراہی سے بچا دے۔ عمر نے یہ کہاں سے سمجھ لیا کہ قلم و کاغذ کا آنحضرتؐ کو دینا واجب نہیں تھا کیا جب بزم رسالت میں دو گروپ ہو گئے اور اس ہنگامہ کے بعد جب حضرتؐ نے عمر کو اپنی بزم سے ہٹا دیا

اور تحریر نہیں لکھی تو عمر سمجھے کہ اگر لکھنا واجب ہوتا تو حضرت تحریر سے باز نہ آتے۔

سوال یہ ہے کہ اگر عمر یہ سمجھے کہ قلم و کاغذ کا آنحضرتؐ کو دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے تو کیا ایک مستحب سے روکنے کے لئے اس قدر شدید لب و لہجہ اختیار کیا جاتا ہے کہ عام آدمی بھی بیماری کی حالت میں کسی کو خبط الحواس نہیں کہتا ـــــ ان سب کے بعد عمر کا "حسبنا کتاب اللہ" کہنا صراحتہً حکم نبی کی مخالفت اور مصلحت و اساس اسلام میں دخل اندازی ہے۔

اور اگر واجب و مستحب کی بحث کو عنوان قرار دیں تو عمر کے لئے صرف یہ کہدینا کافی تھا کہ آپ کے حکم کا بجالانا واجب نہیں ہے۔

بہر حال واقعات کے سیاق و سباق سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضرتؐ جس "نوشتۂ نجات ابدی" کو تحریر کرنا چاہتے تھے جس کو عمر نے "حسبنا کتاب اللہ" کہکر لکھنے نہیں دیا وہ حضرت علیؑ کی جانشینی تھی لہٰذا ہر گمراہی و اختلاف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا یا ہوگا سب کا سرچشمہ حضرت علیؑ کی خلافت کو نہ ماننا ہے۔ یہی مسئلہ، انکار خلافت ہر گمراہی کی جڑ ہے۔

اگر آنحضرتؐ کو "نوشتۂ نجات" کے لکھنے کی اجازت مل جاتی تو کسی شک و اختلاف کی گنجائش رہ نہیں جاتی اور ان ساری باتوں کے بعد اختلاف کرنے والا اسلام سے خارج ہوتا۔

ان مخالفتوں کے بعد آنحضرتؐ نے خلافت حضرت علیؑ کے اثبات

واظہار کے لئے نہ زبانی کچھ کہا اور نہ کوئی تحریر چھوڑی شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو ضدی قسم کے لوگ جم جائیں اور پھر اسلام سے خارج ہو جائیں جو خود خلافت کے چھننے سے زیادہ بڑی مصیبت ہے ــــ انہیں باتوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کیا کہ وہ عام مسلمانوں کے دوش بدوشؑ ہو رہیں۔ خود خطبۂ شقشقیہ میں حضرتؑ نے فرمایا ہے:

"میں سوچنے لگا یا بے یار و مددگار حملہ کر دوں یا شب تاریک پر صبر کروں تو صبر کو بہتر پایا"

تیسری فصل

سقیفہ[1] والوں کے نظریات

انصار کا یہ خیال تھا کہ خلافت کا استحقاق ان تک پہنچتا ہے ۔ چونکہ انصار ہی تھے جنھوں نے اسلام و مرسل اعظمؐ کی نصرت و مدد کی جب مددگاروں کا فقدان تھا اور اس وقت مسلمان ہوئے جب مسلمان خال خال تھے

انصار ہی تھے جنھوں نے اسلام کی خاطر جان و مال فدا کر دیا تب ہی تو آنحضرتؐ نے انہیں "انصار" کے لقب سے نوازا تھا ۔

انصار ہی تھے جن کے خدمات کی بنیاد پر سیدۂ زہراؑ نے اپنے عظیم خطبہ میں "مربّی اسلام و حامی ملت" کے خطاب سے یاد کیا ۔

---

[1] سقیفہ کے معنی ڈھکی ہوئی جگہ کے ہیں ۔ مثلاً مہمانسرا وغیرہ ۔ ساعدہ بن کعب بن خزرج انصار کے رئیس و سردار تھے و سعد بن عبادہ خزرج کے رئیس و سردار ۔ ان لوگوں کے پاس ایک مہمانسرا جیسی اوپر سے ڈھکی ہوئی عمارت تھی جس میں اپنے فیصلے کرتے تھے ۔ چونکہ آنحضرتؐ کے ارتحال کے بعد اسی عمارت میں سعد بن عبادہ کیلئے بیعت کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ اسی لئے سقیفہ بنی ساعدہ سے شہرت ہوگئی ۔

انصار کا خیال تھا کہ اسلام پروری اور حمایت دین میں ان کے خدمات
ایک مسلمہ حقیقت ہیں جس سے کسی کو انکار کا یارا نہیں۔ قصر اسلامی کو محکم
کرنے میں ان لوگوں نے کارنمایاں انجام دیئے ہیں ان کا ذکر خیر زبان زد خاص

و عام ہے لہٰذا خلیفہ اسلامی انہیں میں سے ہونا چاہیئے۔
دوسری طرف اس خلافت کے لیے اس لیئے امیدوار ہوئے کہ انہیں
خطرہ تھا اگر یہ خلافت قریش و عربوں تک منتقل ہوئی تو انصار کا صفایا ہو جائیگا
چونکہ حمایت اسلام کی خاطر انہوں نے عربوں اور قریش پر ضرب کاری لگائی
تھی انصار کی تلواروں نے عربوں کے حواس باختہ کر دیئے تھے یہی
ناتوان انصار تھے جن کے سہارے آنحضرتؐ نے عربوں کے جاہ و جلال
کو تہس نہس کر دیا عربوں کے نزدیک یہ انصار اس قدر مجبور و ناتواں
تھے، ان کے آذوقوں کی فراہمی کا انحصار آب کشی پر تھا۔
یہی نہیں ان انصار نے سردار و رؤسائے عرب کو تہہ تیغ و قیدی
بنایا تھا ان کی تلواروں کی دھمک نے عربوں کو ان کا فرمانبردار بنا دیا تھا۔
لیکن آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت انصار کا شمار ایک عام مسلمانوں
جیسا تھا ان میں اپنے دفاع کی قوت باقی نہیں تھی، اور چونکہ انصار کے
سامنے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بھی تھا کہ ——

تمہیں ہمارے بعد خود غرضیوں کا سامنا کرنا پڑے گا
صبر کرنا یہاں تک کہ حوض کوثر پر ہم سے جا ملو۔

انہیں حالات و پس منظر میں حباب بن منذر نے سقیفہ میں کہا

مجھے خوف ہے کہیں خلافت ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے جن کے افرادِ خاندان بھائی باپ ہم لوگوں کے ہاتھوں جنگوں میں مارے گئے ہیں۔

حباب بن منذر کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ بنی امیہ نے سریر اقتدار تک پہنچ کر کیا ظلم وستم نہیں کئے۔ واقعہ حرّہ میں کیا شرمناک افعال انجام پائے واقعہ حرّہ کی سیاہ کاریوں سے جبین انسانیت شرم سے عرق عرق ہے۔ ہر غیرت دار مسلمان نے اس دلسوز واقعہ سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا۔

اگرچہ خلافت کے حقیقی وارث حضرت علیؑ تھے لیکن جس وقت انصار نے محسوس کر لیا کہ یہ خلافت حضرت علیؑ کو نہیں ملے گی تو انہوں نے اپنے کو خلافت کے لئے علم کر دیا چونکہ انہیں یہ خطرہ تھا:

- کہیں ایسا نہ ہو وہ لوگ سریر اقتدار تک پہنچ جائیں جن کے آباء واجداد ان کے ہاتھ قتل ہوئے ہیں۔
- مدعیان خلافت نے اسلام کے لئے وہ کارنامے انجام نہیں دئیے ہیں جس قدر انصار نے انجام دئیے تھے۔ لہٰذا خلافت کا استحقاق انصار کو پہنچتا ہے اس لئے وہ سقیفہ میں اکٹھا ہوئے۔
- انصار کا دعویٰ تھا کہ اگر حضرت علیؑ کو خلافت دینا ہوتا تو نہ لشکر اسامہ میں جانے سے گریز کرتے اور نہ "نوشتۂ نجات" کے لکھنے سے رسول اکرمؐ کو روکتے۔

لیکن جس وقت انصار کو اپنے منصوبے میں شکست ہوگئی اس وقت یک زبان ہو کر سارے انصار یا بعض انصار نے یہ نعرہ لگایا:

"ہم سوائے علیؑ بن ابی طالب کے کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔"[1]

لیکن یہ نعرہ بصرہ کی تاراجی کے بعد لگایا گیا۔

یہ وہ اسباب و عوامل تھے جس کی وجہ سے انصار نے اپنے کو خلافت کا امیدوار قرار دیا اور ایک سادہ لوح انسان انہیں اسباب کو وجہ قرار دیتے ہوئے انصار کو معذور سمجھتا ہے۔ اور اس طرح عمداً یا انجانے میں خواہشات نفسانی نور حق سے دور کر دیتی ہیں ــــ علم نفس نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیکن اگر دقّت نظر کے ساتھ انصار کے اقدام کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ کیوں انصار نے خلافت کے لئے اس قدر جلدبازی کی اور خفیہ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے اور انہوں نے نہ تو مسلمانوں سے مشورہ لیا اور نہ ہی مہاجرین کو دعوت دی۔

وجہ یہ تھی کہ انصار چاہتے تھے کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام اور اصحاب کو اطلاع ہوئے بغیر اپنے "قبیلہ" خزرج کے کسی سردار مثلاً سعد بن عبادہ یا انصار میں سے کسی اور کو خلیفہ رسولؐ منتخب کرلیں، اس طرح مسئلہ خلافت قبل اس کے کہ اس کے صحیح حقدار یا دعویداروں کے درمیان موضوع بنے، انصار اس کو حل کر چکے ہوں ــــ اور انصار کو یہ خیال بھی تھا کہ انہیں اس راہ میں کامیابی بھی مل جائے گی۔

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۱۹۸، ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۷ وغیرہ وغیرہ

انصار کی ذہنیت

اگرچہ میں نے گزشتہ صفحات میں یہی کوشش کی ہے کہ انصار کے اقدام کو ہر طرح کی بدگمانی سے بچائے جاؤں۔ لیکن درحقیقت جتنی توجیہیں ان کے اقدام کو حق و درست ثابت کرنے کے لئے کی ہیں وہ مذہبی نقطۂ نظر سے حق بجانب نہیں ہیں اگرچہ ہماری خواہش یہی ہے کہ وہ اپنے اقدام خلافت میں بے خطا بنے رہیں تاکہ اس طرح بہت سے اصحاب پر گمراہی کا الزام عاید نہ ہو۔

بہرحال انصار نے خلافت کے لئے جو اقدام کیا ہے خواہ نیت کچھ بھی رہی اس کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جب یہ طے ہے کہ امام علیؑ کے لئے نص موجود تھی لہٰذا اس فرض کی روشنی میں ان لوگوں کا سقیفہ میں جمع ہونا اسلام کے لئے خیانت تھا اور مسلمانوں کے نزدیک ان لوگوں کی خود رائی قطعاً ناجائز تھی وہ بھی اس وقت جب آنحضرتؐ کی دائمی مفارقت نے اسلام کو سراسیمہ اور مسلمانوں کے حواس باختہ کر دیئے تھے۔ کسی کو اسلام دشمنوں اور عربوں کے رویہ اور طرز عمل کی خبر نہیں تھی۔

میں ابھی نہیں چاہتا فیصلہ کر دوں کہ انصار نے جو کیا غلط کیا چونکہ ممکن ہے کسی کی نظر میں ان لوگوں کا اقدام صحیح ہو۔ مجھے بھی ابھی سے انصار کے لئے کوئی رائے قائم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا فریضہ ہے کہ جن اسباب وعلل نے ان حضرات کو خلافت کا امیدوار بنایا اس کی جانچ پڑتال ہو جائے۔

۱۔ گزشتہ صفحات پر اشارہ کر چکا ہوں کہ انصار اپنے دیرینہ خدمات کی وجہ سے اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس کا اظہار سعد بن عبادہ نے

اپنی تقریر میں کر دیا تھا۔

ب۔ جب انصار نے محسوس کر لیا کہ خلافت حقدار تک نہیں پہنچے گی تو اس خوف سے کہ کہیں ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے جن کے آباء و اجداد انصار کے ہاتھوں مارے گئے ہیں لہٰذا اپنے کو امیدوار خلافت قرار دے لیا اس کا اظہار اس وقت ہوا جب اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوئے تو ــــ کہا ــــ ہم علیؑ بن ابی طالب کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

ان باتوں سے ہمارے سامنے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

ا۔ انصار کا اقدام جارحانہ کم اور مدافعانہ زیادہ تھا ــــ اور یہ اپنی جگہ طے ہے کہ دفاعی انداز انسان کے ضعف و کمزوری کی ترجمانی کرتا ہے ــــ یہ احساس ان لوگوں کے لئے جو زندگی میں عروج چاہتے ہیں بہت بڑا المیہ ہے۔ اس دفاعی پہلو کی وجہ سے ہر عزم و ارادہ ناکام ہو کر رہ جاتا ہے۔ سقیفہ میں انصار اسی کا شکار تھے ــ اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے مہاجرین کے پہنچتے ہی بغیر کسی چون و چرا کے سقیفہ میں خلافت کو اپنے اور مہاجرین کی شرکت کے ساتھ طے کرنے پر راضی ہو گئے۔

نمائندۂ انصار کے یہ الفاظ تھے:

"اگر خلافت میں ہمارے اور تمہارے درمیان اختلاف ہو اس وقت راہ حل یہی ہے کہ ایک ہمارا امیر ہو گا

اور ایک تمہارا۔ اس کے علاوہ کوئی راہ حل نہیں ہے

نمائندے کے اس بیان کے بعد سعد بن عبادہ نے کہا یہ تو پہلی شکست ہے ــــ درحقیقت یہ انصار کی پہلی و آخری شکست تھی، سعد کے اعتراف کے باوجود انصار "منا امیرٌ و منکم امیرٌ" کے نظریے پر ڈٹے رہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انصار صلح پسند و نرم مزاج تھے اور اور اس پہلو کی طرف بھی روشنی پڑتی ہے کہ انصار میں دفاعی جنبہ احتجاجی جنبہ سے زیادہ تھا۔ ان لوگوں کا مقصد خلافت سے حکومت و حکمرانی نہیں تھا بلکہ چاہتے تھے کہ خلافت کے ذریعہ ان امکانی خطروں کا دفاع کر سکیں جس کا انہیں احساس تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انصار قریش کے مقابلے میں اپنے ارادوں میں کمزور، سیاست میں بے جان اور یار و مددگار نہ رکھتے تھے اگرچہ حباب بن منذر کی کوشش یہی تھی کہ لوگوں پر ان لوگوں کی کمزوریاں آشکار نہ ہوں جیسا کہ تقریر کے لب و لہجہ سے آشکار ہے:

اے انصار! اپنے امور کی باگ ڈور خود سنبھال لو سب تمہارے پرچم کے نیچے ہیں کسی میں جرأت و ہمت نہیں ہے کہ تم سے اختلاف کر سکے تم لوگ صاحب عزت و ثروت ہو۔

حباب بن منذر نے انصار کو باہمی اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور اپنی جوشیلی تقریر سے ان کے عزم و ارادوں کو للکارا تاکہ احساس

کمتری کے غار سے نکل سکیں۔ حباب کی تقریر کا یہ حصہ اس کے اندرونی

جذبات کا عکاس ہے:

"اگر مسئلہ خلافت میں ان لوگوں نے ہمارے نمایندے
اور اپنے ایک نمایندے کو قبول نہ کیا تو اختلاف نہ کرنا"

اس جگہ حباب سے سوال کروں گا کہ اگر قریش نے تمہارے نمائندے کو قبول نہ کیا تو پھر تمہارے پاس چارہ کیا ہے۔؟ حباب کا خلافت سے بے چارگی کے عالم میں دست بردار ہو جانا اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ استحقاق خلافت کے لئے دعوے کئے تھے سب سے اپنے کو علیحٰدہ کر لیا۔

اس طرح سے اپنے عزم وارادے اور نظریات سے دست بردار ہونا اس کی علامت ہے وہ اپنے فیصلے اور طریقہ کار میں شکست کھا چکا ہے۔ حباب کی تقریر خود اس کے خلاف مضبوط سند ہے، اسی لئے تو عمر بن خطاب نے کہا:

"دو آدمی ایک وقت میں حکومت نہیں کر سکتے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حباب بن منذر انصار میں سب سے زیادہ ہی بہادر اور قادر الکلام تھا اور سعد بن عبادہ کے علاوہ مہاجرین کے لئے سب سے زیادہ تند و سخت تھا۔

شاید ان چند سطروں کے ذریعہ ہم انصار کے جذبہ احساس کمتری ضعف ارادہ اور پھسپھسے منصوبے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ساری کمزوریاں اور نقائص اس انسان کی زبان سے جاری ہوئیں جس کو انصار کے

جتھے پر ناز، اپنے نفس پر اعتماد، اور اوروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مغرور انصار کے درمیان صاحب نظر اور شیوا بیان خطیب کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انصار کو کس بات کا خوف تھا جس کی وجہ سے انہوں نے باہمی اختلاف سے اجتناب کیا۔؟

شاید یہ محسوس کر لیا تھا کہ اختلاف کی چنگاری شعلہ ور ہونیوالی ہے جو حقائق کو خاکستر کر دے گی۔

آئندہ صفحات میں اس کی طرف اشارہ کرونگا۔

انصار کی دو پارٹیاں

سعد بن عبادہ کی خلافت کے امیدوار انصار سے مراد قبیلہ خزرج ہے۔ قبیلہ اوس اس سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوس کی بیعت کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤرخین لکھتے ہیں کہ خزرج نے خلافت کے لئے جو اجتماع کیا تھا وہ ناکام ہو گیا۔

اگر کہیں سقیفہ میں اوس بھی خزرج کے دوش بدوش اکٹھا ہو گئے ہوتے تو دونوں ایک ہی احساس کا شکار ہوتے چونکہ قبیلۂ اوس بھی یہی چاہ رہے تھے کہ خلافت "انصار" کو نہ ملے جن کے ہاتھوں سے ان کے آباء و اجداد مارے گئے ہیں۔

قبیلۂ اوس کے دلوں میں قبیلہ خزرج کے لئے بغض و عناد کا جوالا مکھی

موج زن تھا۔ ان دو قبیلوں نے ایک دوسرے کو تہہ تیغ کیا تھا۔ مدتوں

دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کے خون سے رنگین تھیں۔ طرفین کو

ایسے کاری زخم آئے تھے کہ مندمل ہونا مشکل تھا۔

ان دونوں کے درمیان آخری خوں آشام جنگ "بُعاث" ہے جو آنحضرتؐ کی ہجرت سے چھ سال قبل لڑی گئی ان لوگوں کے مسلمان ہونے کا سبب بھی یہی جنگ ہے۔ چونکہ ان میں سے ایک قبیلہ کا سردار مکہ معظمہ قریش سے نصرت و مدد کے لئے پہنچا اس کی ملاقات سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی اور خدا نے ہدایت فرمائی آپ کے دست وحی پر مسلمان ہوا۔

جنگ بعاث میں اوس کا رئیس لشکر ابو اسید بن حضیر تھا اسی شخص نے سعد بن عبادہ کی خلافت کے خلاف قدم اٹھایا اور ابوبکر کی حمایت میں اس سے جا ملا۔ اسی طرح قبیلہ خزرج کا رئیس و سردار ابو نعمان عمرو بن نعمان تھا۔ جسے جنگ اُحد میں مسلمانوں کے لشکر کا پرچم سپرد کیا گیا تھا۔

تحریک اسلامی نے اگرچہ دونوں کے درمیان آتش جنگ کو خاموش کر دیا تھا لیکن دیرینہ عداوت قلب میں اسی طرح حسد و کینہ کی شکل بھڑکتی رہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اوس و خزرج دونوں ہمیشہ

۱؎ عقد الفرید ج ۲ ص ۲۵۰

انبیاء گزشتہ کو موت آئی ہے تو آنحضرت کو بھی موت آئے گی۔ لیکن عمر اپنے قول پر جمے رہے لیکن مجمع رفتہ رفتہ ان کے گرد سے چھٹنے لگا اور ابوبکر ایک دوسرے گوشہ میں کھڑے ہو گئے۔ مجمع بھی دھیرے دھیرے ان کے گرد جمع ہونے لگا۔ ابوبکر نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــ

"جو محمد صلعم کی عبادت کرتے تھے وہ مر گئے لیکن جو خدا کی پرستش کرتا تھا تو خدا زندہ ہے اس کے بعد اس آیت کی تلاوت کی۔ اگر محمد مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تم اپنے اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔"

دوسرا ثبوت کہ عمر کی تقریر نے لوگوں پر اثر کیا، یہ ہے کہ جس وقت ابوبکر نے رحلت کی خبر دی عوام کے تأثرات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان پر ایک زبردستی ہو رہی تھی جس سے وہ آزاد ہو گئے اور سب نے ابوبکر کے ساتھ مل کر اسی آیت کی تلاوت کرنا شروع کر دیا جس طرح ابوبکر تلاوت کر رہے تھے۔

ابوبکر کے اس اقدام سے عمر زمین پر غش کھا کر گر پڑے اور جب انکو یہ معلوم ہوا کہ ابوبکر نے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو عمر کا بیان ہے کہ ـــ میں نے بھی ارتحال آنحضرت کی تصدیق کر دی۔

للہ ابوک یا بن الخطاب

عمر، خدا تم سے سمجھے۔ تمہاری تہہ دار شخصیت نے مجھے حیرت

میں ڈال دیا ارتحال رسول اکرمؐ جیسے دردناک ماحول میں تم نے قسمیں کھا کر ایک سچی حقیقت کا انکار کرنا چاہا کیا اسلام نے تمہیں حقیقت مرسل اعظمؐ سے آشنا نہیں کیا تھا، تم اب تک اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ آنحضرت کو بھی موت آسکتی ہے جو ان کی موت کے منکر ہوئے

اور خبر موت منتشر کرنے کو پروپیگنڈے سے تعبیر کیا

نہیں ــــ تمہاری کوشش تھی کہ عوام کو یہ باور کراؤ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کے لئے اپنی امت سے چالیس روز کے لئے غائب ہوئے تھے اسی طرح آنحضرت نے بھی غیبت اختیار کی ہے۔ لیکن ذرا عمر انصاف تو کرو یہ کونسی غیبت تھی کہ آنحضرت اپنے بستر پر بے حس وحرکت پڑے تھے۔

اس سے زیادہ حیرت تو اس پر ہے کہ کہیں اس سختی و دھمکی سے پیغمبر اسلامؐ کی موت کا انکار کر رہے تھے کہ کہنے والے کو قتل کرنے پر تیار تھے اور کہیں صرف ابوبکر کے کہنے سے بالکل رام ہو گئے درآنحالیکہ ابوبکر کے بیان سے نہ تمہاری تصدیق ہو رہی تھی اور نہ تکذیب۔

تمہارا دعویٰ تھا کہ جب تک اسلام کو غلبہ نہ ہو جائے اس وقت تک رسول خداؐ کو موت نہیں آسکتی ہے۔ ابوبکر نے جس آیت کی تلاوت کی تھی اس کا تمہارے دعوے سے کیا ربط تھا؟ اس آیت میں کونسی ایسی بات تھی جس سے تم مطمئن ہو کر دھڑام سے زمین پر گر گئے۔ کیا یہ آیت رحلت پیغمبر اسلامؐ کی خبر دے رہی تھی۔؟

دو سانڈ کی طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے افعال پر تنقید کرتے رہتے اور دونوں کا نعرہ تھا — "یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ ہم سے کسی چیز میں برتر ہو جائیں"[1]

باہمی اختلاف کا ایک مورد تو اس وقت سامنے آیا جس وقت مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مسلمانوں سے قبیلہ خزرج کے مشہور منافق عبداللہ بن ابی سلول کی گرفتاری کی تاکید فرمائی۔

حضرت کے الفاظ تھے — "مسلمانو! تم میں کون ایسا ہے جو اس شخص کو گرفتار کرکے لائے جس نے ہم لوگوں کو ستا رکھا ہے۔"

سعد بن معاذ، قبیلہ اوس کے سردار نے کہا:

"سرکار میں گرفتار کروں گا اگر میرے قبیلہ کا ہو تو اسکی گردن اڑا دوں گا اور اگر برادران خزرج کی فرد ہو تو آپ جو حکم فرمائیں اس پر عمل کرونگا۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دونوں کے درمیان کس قدر اندرونی اختلاف تھا جانتے ہوئے کہ عبداللہ بن ابی سلول قبیلہ خزرج کا ہے لیکن اس کے باوجود سعد بن معاذ نے تجاہل سے کام لیا۔

قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ نے اپنے مد مقابل قبیلہ کے رئیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "تم جھوٹے ہو نہ تم اس کو قتل کروگے

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷، ابن اثیر ج ۲ ص ۶۶

اور نہ کر سکتے ہو اور اگر اپنے طرفداروں کے ساتھ بھی چاہو تو اس کو قتل نہیں کر سکتے۔

اس جواب کو سننے کے بعد سعد بن معاذ کا چچا زاد بھائی اسید بن حضیر کھڑا ہوا اور اس طرح مقابل سے بولا:

"خدا کی قسم تم جھوٹے ہو۔ میں حتماً اس کو قتل کروں گا، تم منافق ہو اور منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔"

اوس و خزرج آپس میں گتھ گئے عنقریب تھا خون خرابہ ہو جائے پیغمبر اسلامؐ اس منظر کو منبر سے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آخر منبر سے تشریف لائے اور دونوں قبیلوں کو ٹھنڈا کیا اور پھر خود بھی کچھ نہیں کہا۔[1]

بلاشک دونوں قبیلوں کے درمیان رشک و رقابت اوج پر تھی صرف سعد بن عبادہ تھے جنھوں نے سقیفہ کی کاروائی میں چاہا "بنام انصار" قبیلۂ اوس بھی خزرج سے جا ملے چونکہ یہ دونوں قبیلے مہاجرین و انصار کے مقابلہ ایک پارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اسی لئے جو خطبہ دیا اس میں مخاطب انصار کو قرار دیا اور اپنے حریفوں کو زک دیتے ہوئے کہا:

"اے گروہ انصار! تمہیں دین میں ایک فوقیت حاصل ہے تمہاری فضیلت و فوقیت کا مقابلہ عرب کا کوئی قبیلہ نہیں کر سکتا۔ اس جگہ "عرب" سے اشارہ مہاجرین

---

[1] بخاری ۲ صـ۶ ۳ صـ۲۴

کی طرف تھا۔"

سعد بن عبادہ نے آخر تک اسی آہنگ و تیور سے خطبہ دیا۔ جس کے جواب میں مجمع نے کہا۔ اگر تم اپنے نظریات و خیالات کو دوسروں کے افکار سے ہم آہنگ کر لو اور حق بات کہو تو ہم لوگ تمہیں خلیفہ تسلیم کر لیتے ہیں اور ہرگز تمہاری نافرمانی نہیں کریں گے۔ تمہاری خلافت پر ہم لوگ راضی ہیں اور مسلمانوں کو پسند ہے۔

سعد کی تقریر کے بعد آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ اگر مہاجرین قریش نے بیعت سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا جس پر کچھ نے کہا، پھر ایک کمیٹی تشکیل دیں گے جس میں ان کا اور ہمارا دونوں کا نمائندہ ہوگا — اس تجویز پر پھر سعد بن عبادہ نے کہا — یہ تو ہماری شکست ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ تجویز انصار کے ارادوں کی کمی کی دلیل ہے اور یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے اندر خود اتحاد و اتفاق نہیں تھا۔ کینہ و حسد کی چنگاری سلگ رہی تھی جس کے باعث سعد بن عبادہ کی تقریر سے متاثر نہ ہوئے اور اس قدر بے توجہی کا ثبوت دیا کہ مہاجرین ان پر غالب آگئے۔ ورنہ سعد کی خلافت کا امکان قوی تھا۔ چونکہ ان لوگوں نے سقیفہ میں مہاجرین کی آگاہی سے قبل اجتماع کر لیا تھا، لیکن ان لوگوں کی سستی نے اس موقع کو کھو دیا اگرچہ سیاست کی اصطلاح میں اس کو سستی نہیں کہتے۔

حق یہ ہے کہ قبیلہ اوس کو سعد بن عبادہ کی خلافت پسند نہیں

تھی چونکہ قبیلہ خزرج سے چھوٹی سے چھوٹی بات پر حسد و رقابت پائی جارہی تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ اگر اختلاف کرتے ہیں تو قبیلۂ اوس و خزرج، بدنام ہو جائیں گے جہاں تک ہو سکے ظاہر بظاہر اوس و خزرج کے درمیان حُسن عمل پایا جائے جس کی اسلام

دعوت دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب قبیلۂ اوس نے دیکھا کہ خود قبیلہ خزرج کے اندر پھوٹ پڑگئی۔ خود خزرجیوں نے سعد کی حمایت نہیں کی اور بشیر بن سعد خزرجی کی تحریک پر ابوبکر کی خلافت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو اوسیوں نے اپنے دلی کینے کا اظہار کر دیا۔

بشیر بن سعد پہلا شخص ہے جس نے اپنے قبیلے کے ساتھ ابوبکر کی بیعت کی۔ بشیر کی اس بیعت کے بعد قبیلہ اوس کے کچھ لوگوں نے اسید بن حضیر کی قیادت میں کھلم کھلا سعد بن عبادہ کی مخالفت شروع کر دی۔ اسید کا بیان تھا کہ اگر ایک بار سعد کو خلیفہ بنا دیا تو ہمیشہ یہ فضیلت انہیں لوگوں میں رہ جائے گی کبھی پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آسکتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ابوبکر کی بیعت کرلو۔ تقریر کے بعد اسیدؓ نے اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ ابوبکر کی بیعت کر ڈالی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ابوبکر کی خلافت سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ ہوا، جواب یہی ہے کہ باہمی حسد و عداوت کی وجہ سے اسید نے یہ بات زبان سے نکالی ورنہ حقیقت میں جو اختلاف خود مہاجرین سے

تھا وہ بھی کم نہ تھا۔

ساری باتیں اپنی جگہ پر لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابوبکر نے "اوسیوں" کو مہاجرین کا طرفدار بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ابوبکر کو معلوم تھا کہ اس اختلاف سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ابوبکر نے کہا:

"اگر خلافت قبیلہ خزرج کے افراد لینا چاہیں تو قبیلہ اوس ان سے کم نہیں ہیں اور اگر اوس تک منتقل ہو تو خزرج کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ یہی نہیں دونوں نے ایک دوسرے کی ایسی فردوں کو قتل کیا ہے بھلایا نہیں جا سکتا ہے اور ابھی تک ایسے مجروح ہیں جن کا معالجہ نہیں ہوا ہے۔ اس وقت اگر کوئی ایک قبیلہ خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو مہاجرین اور دوسرے قبیلہ کی زد پر ہے گویا شیر کے منہ میں ہے"

ابوبکر کی تقریر نے دونوں کے کینوں کو اور ابھار دیا اور اوس و خزرج کو ایک دوسرے کے خلاف برانگیختہ کر دیا۔ اور واضح کر دیا کہ اوس و خزرج ترازو کے دو پلّے ہیں کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں ہے۔

ابوبکر نے دونوں قبیلوں کی دفن دشمنیوں کا تذکرہ کر کے دونوں کی حمیّت و غیرت کو جگا دیا اور بہ آسانی اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ اور صاف و صریح لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر اوس و خزرج میں کوئی خلافت

لیتا تو غلط کرتا چونکہ ایک ان کی مخالفت خود حریف قبیلہ کی طرف سے ہوتی اور دوسری طرف مہاجرین تھے جو ان کی خلافت کے مخالف تھے اسی نکتہ کی طرف ابن داب عیسیٰ بن زید نے اشارہ کیا ہے — ابوبکر

نے وہ بات کہی کہ انصار کا ناطقہ بند ہوگیا۔

گزشتہ چند صفحات سے ہم نے اوس و خزرج کے درمیان پائی جانے والی دشمنی و عداوت و کینہ کا اندازہ لگا لیا اسی سے اس کا اندازہ ہو جائیگا کہ اس اختلاف کا سقیفہ پر کتنا اثر مرتب ہوا اور یہ پتہ بھی چل جائیگا کہ کیا صرف خزرجیوں نے سقیفہ میں خلافت کے لئے کوشش کی تھی یا قبیلہ اوس کے لوگ بھی شریک تھے۔

اب اوس و خزرج کو اسی جگہ چھوڑتے ہیں — اب ذرا مہاجرین اور بقیہ مسلمین کے حالات کا جائزہ لیں کہ انہوں نے کیا کیا اور کہاں رہے۔؟

رخصتِ رسول اعظمؐ

اپنی حیات کے آخری دن مرسل اعظم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بیت الشرف سے نماز صبح پڑھانے کے لئے تشریف لائے۔ یہ آخری موقع ہے جب مسلمانوں نے اپنے محبوب قائد اور نور الٰہی کے جمال کی زیارت کی۔

ابھی آفتاب آسمان کو زوال نہیں ہوا تھا کہ آفتاب زمین مغرب ابد میں روپوش ہوگیا، مرسل اعظمؐ بستر فراق پر پڑے ہیں اور آپ کے

اہل بیت آپ کی جدائی پر گریہ و زاری کر رہے ہیں عوام الناس کو بیت الشرف
میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

ارتحالِ آنحضرتؐ بھی کیا عظیم دن تھا اہل مدینہ اور مسلمانوں نے کیا عظیم سرمایہ و نعمت کھویا تھا۔
اخلاق الٰہی سے محروم ہوئے تھے۔
رحمت و انسانیت کو کھو دیا تھا۔
اپنی عزت و شرف کے کھیون ہارے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑے تھے۔
اس سے بچھڑے تھے جس نے آیات الٰہیہ سے صراط مستقیم کی راہنمائی فرمائی
جو اللہ کا نور تھا۔
نبی اکرمؐ سے نہیں محروم ہوئے تھے بلکہ اپنے شفیق باپ سے محروم ہوئے تھے۔
حقیقتاً بڑی مصیبت کا دن تھا اور عظیم شخصیت کو مسلمانوں نے کھو دیا تھا
یہ دن اتنا عظیم دن تھا کہ بعد والوں نے ضرب المثل بنا لی تھی کہ جب کوئی
بڑی مصیبت آتی تو کہتے آج وہ دن تھا گویا — مرسل اعظم دنیا سے گئے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیت الشرف سے دم بدم آواز
گریہ و شیون بلند ہے۔ کسی کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو
یہ خیال ہوگا کہ اس وقت مسلمان افتاں خیزاں حضرت کی مسجد اور
بیت الشرف کے ارد گرد جمع ہوں گے — حادثۂ ارتحال کو سننے کے
بعد کوئی آنکھ نہیں ہوگی جو روئی نہ ہو اور کوئی قلب نہیں ہے جو
مضطرب نہ ہوا ہو اور کوئی دل نہیں ہے جس کی دھڑکن رُک نہ
گئی ہو۔

ایسے میں مسلمانوں کو انتظار ہے کہ کیا ہونے والا ہے ؟

کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان خبر ارتحال نبی اعظمؐ کو جھٹلا دیں عوام پر واضح ہوگیا کہ زندگی کا نیا موڑ شروع ہو چکا ہے ۔ ہر ذہن اس فکر میں غرق ہے کہ آنے والے حادثات و اتفاقات کا حل کیا ہے ، اس احساس نے حواس باختہ کر دئیے تھے ۔ ہر ذہن کو اس اسلام کے مستقبل کی فکر تھی جس نے جزیرہ عرب سے کلمہ پڑھوا لیا تھا ۔

کہیں ایسا نہ ہو منافقین موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منصب خلافت کے لئے اپنی بھاگ دوڑ تیز کر دیں اور مکر و حیلہ سے جانشینی رسولؐ تک جا پہنچیں ۔

بلاشبہ یہ سب خیالات بلکہ اس سے بھی زیادہ تصورات درِ رسالت کے اردگرد جمع ہونے والے حواس باختہ مسلمانوں کے ذہن میں گردش کر رہے تھے ۔

مسلمان خانۂ وحی کے اردگرد پھر رہے تھے اور ہمیشہ کی طرح آج بھی منتظر تھے کہ کوئی فیصلہ خود اسی خانۂ وحی سے سامنے آئے جس سے ان کے دلی اضطراب میں کمی اور پریشانی خاطر کو سکون مل سکے اور آئندہ کے طریقۂ کار کی وضاحت ہو سکے ۔

حدیث کے مطابق مسلمانوں کی وہ حالت تھی جیسی برفیلی راتوں میں پراگندہ گوسفند کی ہوتی ہے ۔ لیکن اسی سراسیمگی کے عالم میں عمر بن خطاب جنھیں صحابیت کا شرف بھی تھا مسلمانوں میں نعرہ لگایا ۔

"محمد مرے نہیں ہیں اور نہ مر سکتے ہیں کیونکہ پیغمبر اس وقت تک مر نہیں سکتے۔ جب تک دین کو تمام مذاہب پر غلبہ نہ ہو جائے وہ پھر واپس آجائیں گے اور جس کسی نے یہ فتنہ انگیز خبر پھیلائی اس کے ہاتھ و پیر حضرت قلم کر دیں گے اور اگر میں نے بھی کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آنحضرت مر گئے تو تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

بہر حال کیوں خبر وفات پیغمبر اسلامؐ کا ذکر کرنے والے کے ہاتھ و پیر آنحضرت قلم کر دیں گے یا کیوں عمر اس کو دو ٹکڑے کر دیں گے اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات عمر کو کہاں سے معلوم ہوئی کہ جب تک دین تمام مذاہب پر غالب نہ آجائے پیغمبرؐ اسلام مر نہیں سکتے ہیں۔ یا پیغمبرؐ واپس آجائیں گے۔ کیسے واپس ہوں گے کیا موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے یا غیبت اختیار کر لی ہے اس کے بعد واپس ہوں گے؟ جس طرح حضرت موسیٰ نے غیبت اختیار فرمائی تھی بعض حدیثوں میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ عمر کی مراد یہی تھی۔

یہ کیسی غیبت ہے کہ آنحضرت افراد خاندان کے درمیان بستر پر بے حس و حرکت پڑے ہیں؟

لیکن میرا خیال ہے کہ اگر آپ بھی اسی مجمع میں ہوتے تو آپ پر بھی وہی اثر ہوتا جو سب پر ہوا تھا چونکہ عوام ایک عجیب اضطراب و بے چینی

کے عالم میں تھے ان حالات میں عمر نے نہایت یقین و اطمینان اور تحکمانہ انداز سے ایسی بات کہی جس میں سراسر مکر تھا جس نے عوام کو دھوکے

میں ڈال دیا۔

عمر نے اپنی بات کو یہاں سے شروع کیا کہ ـــــ حیات رسولؐ اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر نہیں ہوا ہے اور اگر کسی نے یہ خبر پھیلائی تو خود حضرت اس کے ہاتھ پیر قلم کر دیں گے اور یہی نہیں خود عمر ایسی خبر پھیلانے والے کا قلع قمع کر دیں گے۔

عمر کی پُر اعتماد تقریر نے عوام میں امید و بیم کی سی حالت پیدا کر دی اور جمّ غفیر کو اس تقریر نے سوچنے اور سمجھنے سے ناکارہ بنا دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر عوام کو کسی سے الفت و محبت ہوتی ہے تو اس کی خبرِ وفات کے بعد طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے ہیں اور فطری طور سے جلدی اس کی موت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی وہ بھی نبی اعظمؐ جیسی شخصیت جن کے لئے ہر وہ چیز فرض کی جا سکتی ہے جو دوسروں کے لئے سوچی نہیں جا سکتی تھی۔

مدینہ میں اکٹھا ہونے والے رحلتِ مرسل اعظمؐ سے بلاشبہ شدید متأثر تھے اور ہر شخص اس سے بے خبر تھا کہ اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے، اور جب مجمع کی یہ حالت ہو تو ایسے میں ہر طرح کی فکر ان پر اپنا اثر مرتب کر سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اقدام فکر و شعور سے خالی ہو کر محض ایک تقلید بن جاتا ہے اور غیر منطقی باتوں کو بھی تسلیم

کر لیتا ہے خواہ مکر و حیلہ ہی کیوں نہ ہو ــــــ مدینہ منورہ میں جمع ہونے والوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، حضرت کی جدائی، نامعلوم مستقبل اور عمر کی پُر اعتماد تقریر نے ان کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا لیکن عوام کیلئے یہ ساری باتیں اس قدر تعجب خیز نہیں ہیں۔ تعجب عمر سے ہے کہ انہوں نے کیوں یہ کہا کہ ــــــ آنحضرتؐ زندہ ہیں....

اگرچہ یہ بھی اپنی جگہ طے ہے کہ کسی نے عمر کے بیان کو تسلیم نہیں کیا اور یہ بھی طے ہے کہ غیر از ابوبکر کسی نے عمر کے نظریہ کی مخالفت بھی بھی نہیں کی۔

بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ عمر نے لوگوں کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی رحلت کے سلسلے میں مشتبہ بنا دیا، اور ان کی اس تقریر نے عوام کے فکری دھارے کو پیغمبر اسلامؐ کے بعد رونما ہونے والے حادثات و واقعات سے موڑ دیا کیونکہ حیات پیغمبرؐ اسلام کی خبر سے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حاضرین نے عمر کو حلقے میں لے لیا اور عمر نے بھی غیظ و غضب کی حالت میں کہ کف ان کے منھ سے جاری تھا لوگوں کو ڈرایا دھمکایا کہ ــــــ قطعاً کوئی نبی کی وفات کا یقین نہ کرلے۔

معنی ارجاف

اردو میں ارجاف کے معنی غلط پروپیگنڈے کے ہیں عمر نے اپنی

تقریر میں اس لفظ کو استعمال کیا اور پروپیگنڈے کی شدت سے مذمت
کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خبر وفات پیغمبر اسلامؐ لوگوں کے لئے ایک مذموم
بات بن کر رہ گئی۔

عمر کے اس اقدام نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی پیدا
کر دی کہ وفات پیغمبر اسلامؐ کی خبر پھیلانے والے منافق ہیں اسلام
و مرسل اعظمؐ کے ساتھ دغا کر رہے ہیں۔

اس کا ثبوت ہے کہ عمر کی تقریر نے لوگوں کو پیغمبر اسلامؐ کی زندگی
کا یقین دلایا۔ لہذا جس وقت ابوبکر "سخ" سے مدینہ واپس ہوئے جو
تقریباً کم از کم ایک میل یا زیادہ سے زیادہ چار میل کے فاصلے پر واقع ہے
تو انہوں نے فوراً پیغمبر اسلامؐ کے چہرے کو کھول کر دیکھا تاکہ معلوم
ہو سکے کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔

آنحضرت کو مُردہ پاکر بیت الشرف سے نکلے تاکہ عمر کے خیالات
کی تکذیب کریں۔ اگرچہ ابوبکر کی تکذیب و مخالفت کے باوجود عمر
قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو بتا رہے تھے — آنحضرتؐ زندہ ہیں۔

جس وقت ابوبکر نے مجمع کو آنحضرتؐ کے ارتحال کی خبر دی
عمر نے اس وقت بھی ابوبکر سے تین مرتبہ کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ لیکن ابوبکر
نہ مانے اور جھلا کر کہا —

ایھا الحالف علیٰ رسلکؓ

اے روشِ انبیاء کے خلاف قسمیں کھانے والے یعنی جب

انبیاء گزشتہ کو موت آئی ہے تو آنحضرت کو بھی موت آئے گی۔ لیکن عمر اپنے قول پر جمے رہے لیکن مجمع رفتہ رفتہ ان کے گرد سے چھٹنے لگا اور ابوبکر ایک دوسرے گوشہ میں کھڑے ہو گئے۔ مجمع بھی دھیرے دھیرے ان کے گرد جمع ہونے لگا۔ ابوبکر نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جو محمد صلعم کی عبادت کرتے تھے وہ مر گئے لیکن جو خدا کی پرستش کرتا تھا تو خدا زندہ ہے اس کے بعد اس آیت کی تلاوت کی۔ اگر محمد مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تم اپنے اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔"

دوسرا ثبوت کہ عمر کی تقریر نے لوگوں پر اثر کیا، یہ ہے کہ جس وقت ابوبکر نے رحلت کی خبر دی عوام کے تأثرات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان پر ایک زبردستی ہو رہی تھی جس سے وہ آزاد ہو گئے اور سب نے ابوبکر کے ساتھ مل کر اسی آیت کی تلاوت کرنا شروع کر دیا جس طرح ابوبکر تلاوت کر رہے تھے۔

ابوبکر کے اس اقدام سے عمر زمین پر غش کھا کر گر پڑے اور جب انکو یہ معلوم ہوا کہ ابوبکر نے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو عمر کا بیان ہے کہ۔ میں نے بھی ارتحال آنحضرت کی تصدیق کر دی۔

لله ابوك يا بن الخطاب

عمر، خدا تم سے سمجھے۔ تمہاری تہہ دار شخصیت نے مجھے حیرت

یں ڈال دیا ارتحال رسول اکرمؐ جیسے دردناک ماحول میں تم نے قسمیں کھاکر ایک سچی حقیقت کا انکار کرنا چاہا کیا اسلام نے تمہیں حقیقت مرسل اعظمؐ سے آشنا نہیں کیا تھا، تم اب تک اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ آنحضرت کو بھی موت آسکتی ہے جو ان کی موت کے منکر ہوئے اور خبر موت منتشر کرنے کو پروپیگنڈے سے تعبیر کیا

نہیں ـــــ تمہاری کوشش تھی کہ عوام کو یہ باور کراؤ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کے لئے اپنی امت سے چالیس روز کے لئے غائب ہوئے تھے اسی طرح آنحضرت نے بھی غیبت اختیار کی ہے ۔ لیکن ذرا عمر انصاف تو کرو یہ کونسی غیبت تھی کہ آنحضرت اپنے بستر پر بے حس وحرکت پڑے تھے ۔

اس سے زیادہ حیرت تو اس پر ہے کہ کہیں اس سختی و دھمکی سے پیغمبر اسلامؐ کی موت کا انکار کر رہے تھے کہ کہنے والے کو قتل کرنے پر تیار تھے اور کہیں صرف ابوبکر کے کہنے سے بالکل رام ہوگئے درآنحالیکہ ابوبکر کے بیان سے نہ تمہاری تصدیق ہو رہی تھی اور نہ تکذیب ۔

تمہارا دعویٰ تھا کہ جب تک اسلام کو غلبہ نہ ہوجائے اس وقت تک رسول خداؐ کو موت نہیں آسکتی ہے ۔ ابوبکر نے جس آیت کی تلاوت کی تھی اس کا تمہارے دعوے سے کیا ربط تھا ؟ اس آیت میں کونسی ایسی بات تھی جس سے تم مطمئن ہو کر دھڑام سے زمین پر گر گئے ۔ کیا یہ آیت رحلت پیغمبر اسلامؐ کی خبر دے رہی تھی ۔ ؟

اس سے بدتر تمہاری وہ تقریر ہے جو تم نے دوسرے دن معذرت کرتے ہوئے کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے تمہارے سامنے کل جو تقریر کی تھی اس کے مضمون کا ربط نہ قرآن سے تھا اور نہ ہی پیغمبرؐ اسلام نے اس ضمن میں مجھ سے کچھ کہا تھا جو کچھ کہا وہ صرف ہمارے خیالات تھے ـــ چونکہ دلی خواہش تھی کہ آنحضرتؐ زندہ رہیں اور ہمارے حالات کی نگرانی فرمائیں اور ہم سب سے آخر میں آپؐ کو موت آئے[1]"

کہیں یہ نرمی و آرزوئے حیات رسولؐ، کہیں اس قدر دھمکی و رعب و ہنگامہ کہ خبر موت دینے والے کا قلع قمع۔ یہ سنجیدہ انداز کہاں وہ ہنگامہ آرائی کہاں؟

یقیناً ـــ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

میرے خیال میں اس قدر آسانی سے عمر کی شخصیت پڑھنے والوں پر آشکار نہیں ہو سکتی ہے۔ بہت بعید ہے کہ عمر جیسا انسان آنحضرتؐ کی موت کا منکر ہو جائے درآنحالیکہ یہی شخص علالت سرکار رسالت میں بڑی

---

[1] مجموعہ عبارت اقتباس ہے۔ کنز العمال ج ۳ ص ۱۲۹ ج ۴ ص ۵۴، تاریخ طبری و ابن اثیر و بخاری ۴ ص ۱۵۲ سیرۂ دحلانیہ ۲ ص ۳۴۷۔ "عمر کا یہ قول کنت ارجوان یعیش" صحیح اور السیرۃ دحلانیہ میں موجود ہے لیکن اس کتاب یا دوسری کتابوں میں کچھ مختلف ہے لیکن معنی میں خلل نہیں پڑتا۔

شدّ و مد سے کہہ چکا ہے کہ آنحضرت پر مرض کا غلبہ ہے ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے۔ اگر عمر کو یقین تھا کہ آنحضرتؐ اس قدر جلد رحلت نہیں فرمائیں گے تو پھر کیوں ــــ "حسبنا کتاب اللّٰہ" کہہ کر آنحضرتؐ کو نوشتہ سے روکا۔ ؟

کیا ان سب باتوں کی وجہ یہ ہے کہ رحلت مرسلِ اعظم کی مصیبت عظمیٰ نے ان کے حواس باختہ کر دیئے تھے ؟ ۔ اگر ایسا تھا تو کیوں نہیں دوسرے دن معذرت کرتے ہوئے اسی بات کو کہا ــــ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کا یقین ہو گیا تو بدحواسی کیوں نہ اور بڑھ گئی۔ ؟

عمر جیسے انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ بدحواسی میں پیغمبرؐ اسلام کی رحلت سے غافل ہو جائے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ وہ درحقیقت نہیں جانتے تھے کہ آنحضرت مر گئے۔ اگر ایسا ہے تو جو شخص موت جیسی واضح حقیقت سے بے خبر ہے وہ لوگوں کا امام کیوں کر ہو سکتا ہے۔

بعض نے انکار کی وجہ بدحواسی قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں دونوں وجہیں صحیح نہیں ہیں۔ عمر کو جس طرح پہچاننا چاہیئے اس طرح نہیں پہچانا ہے اور اس واقعہ کی تہہ تک نہیں پہنچے ہیں کیونکہ جس عمر کا یہ دعویٰ ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نے غیبت کر لی ہے۔ ابوبکر کا بیان انہیں اس قدر جلد ان کے دعوے سے منصرف نہیں کر سکتا تھا۔

اگر تصور موت نے اس قدر بدحواس بنایا تھا تو یقین موت پر تو اور

بدحواس ہونا چاہئے تھا۔

میری رائے

اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اس واقعہ کے ہر پہلو پر دقیق اطلاع رکھے تو اس کو چاہئے کہ عمر کی شخصیت کا غائر جائزہ لے چونکہ یہ شخص اس آسانی سے فریب نہیں کھاتا اگر عمر کی شخصیت سامنے آگئی تو پھر واضح ہو جائے گا کہ پس پردہ کیا ہے بہت آسانی سے یہاں سے گذرا نہیں جا سکتا ہے۔

آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ عمر کو اس کا خوف تھا کہ کہیں عوام وہ نہ کر بیٹھیں جو اُن کے منصوبے کے خلاف ہے چونکہ اس وقت سب کی نظر اسی نقطہ پر جمی تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کا جانشین کون ہوتا ہے۔

وقت ارتحالِ ختمی مرتبتؐ عمر کے سامنے بڑا بھیانک موقع تھا چونکہ ان کے جگری دوست اور قوتِ بازو ابوبکر مدینہ سے باہر "سنح" میں تھے ہو سکتا ہے کہ عمر و ابوبکر نے خلافت سے متعلق کوئی سازباز کر رکھا ہو لہٰذا ان حالات میں عمر نے عوامی فکر کو اس طرف موڑ دیا کہ آنحضرت نے غیبت اختیار کی ہے تاکہ عوام اس عرصہ میں ابوبکر کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کر سکیں۔

اس جگہ صرف حضرت علیؑ کی ذات تھی جس پر لوگوں کی نظر

جمی تھی خواہ اس کی وجہ نص رہی ہو جیسا ہمارا عقیدہ یا صلاحیت و لیاقت رہی ہو جس کا اعتراف سارے انصار و مہاجرین کو تھا۔[1] عوام کا حضرت علیؑ سے متعلق چند نظریہ تھا۔

۱۔ کمسن ہیں

۲۔ عرب بالخصوص قریش کو آپ سے حسد تھا چونکہ اسلامی جنگوں میں جو مارے گئے ہیں وہ آپ ہی کے ہاتھوں سے مارے گئے ہیں ۔ اور عربوں کا طریقہ تھا کہ جب وہ بدلہ لیتے تھے تو اس سے لیتے تھے جو اس کے خاندان کی نمایاں فرد ہوتا تھا۔ حضرت علی کا شمار خاندان رسالت کی نمایاں فردوں میں ہوتا تھا۔

۳۔ قریش اس پر بھی راضی نہیں تھے رسالت و خلافت دونوں خاندان بنی ہاشم میں جمع ہو سکے تاکہ انہیں مزید افتخار کا موقع مل سکے۔

۴۔ بقول عمر —— اگر خلافت علیؑ کو ملے گی تو وہ لوگوں کو حق پر چلنے کی تاکید و مجبور کریں گے خواہ عوام کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو —— اور حق کڑوا ہوتا بھی ہے۔

یہ بات واضح ہو گئی کہ عمر خلافت حضرت علیؑ کے شدید مخالف تھے جس کا اظہار نوشتہ رسولؐ اور دوسرے موقعوں پر دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ ابی الحدید ج ۲ ۔ ص ۸

لہٰذا کوئی شبہ نہیں کہ عمر نے خبر وفات کو اسی لئے چھپایا تھا کہ ابوبکر مدینہ میں موجود نہیں تھے اور عوام سے ابوبکر کو یہ خوف تھا کہ کہیں علیؑ

کی بیعت نہ کرلیں۔

کیا عمر نے اس خود ساختہ سازش سے نکل جانے کی راہ بھی تلاش کی تھی؟ میرا گمان غالب یہ ہے کہ عمر کا یہ نظریہ تھا کہ عوام کو علیؑ کی بیعت سے ہم روک دیں گے اس کے بعد کے امور کی ذمہ داری خود ابوبکر پر ہے۔

میرے اس گمان کو تقویت اس سے ملتی ہے کہ جس وقت ابوبکر نے عوام کو موت کی خبر سنائی عمر نے فوراً قبول کرلیا جبکہ ابوبکر کی گفتگو سے نہ عمر کی تکذیب ہو رہی تھی اور نہ تائید۔

ابوبکر نے آتے ہی مجمع میں تقریر شروع کردی۔ لوگ رفتہ رفتہ پہنچنے لگے۔ عمر کو چونکہ معلوم تھا کہ ابوبکر کیا کرنے والے ہیں لہٰذا عمر کا تیار کردہ منصوبہ اسی جگہ ختم ہو گیا اور عمر نے ہوشیاری سے بے ہوش ہو کر اپنے کو زمین پر گرادیا تاکہ عوام کو شبہ نہ ہو کہ کوئی سازش تھی بلکہ اس بے ہوشی کو نبی اعظمؐ کی جدائی پر محمول کریں۔

ابھی کچھ دیر نہ گذری تھی کہ دونوں اپنے منصوبۂ خلافت کو مستحکم کرنے میں لگ گئے اور کہیں سے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ عمر پر حادثہ ارتحال کا کوئی اثر ہے ورنہ انہوں نے جو ڈرامہ رچایا تھا اس کی بنیاد پر بعض لوگوں نے اس حالت کو دیکھ کر کہا تھا کہ پاگل ہو گئے ہیں۔

جلسۂ انصار

تاریخ نہیں بتاتی کہ ابوبکر کی واپسی کے بعد عمر و ابوبکر نے کیا کیا اور سقیفہ کے اجلاس سے پہلے کہاں گئے۔ آیا خانہ رسولؐ پر گئے جبکہ ہر شخص کا داخلہ بند تھا یا پسِ در کھڑے رہے یا صرف ابوبکر بیت الشرف میں داخل ہوئے۔ بہرحال یہ سارے احتمالات ممکن ہیں۔ لیکن عمر و ابوبکر جیسے افراد کے لئے زیبا نہیں تھا کہ وہ خانۂ رسالت پر موجود نہ رہیں۔ اگر کوئی اقدام ہوتا بھی تو وہ اسی جگہ سے ہوتا۔ چونکہ تمام امور کی ذمہ داری اس شخص پر تھی جو مرسل اعظمؐ کی تجہیز و تکفین پر لگا تھا —— یعنی حضرت علی بن ابی طالب پر۔

ابھی عمر و ابوبکر درِ رسالت پر پہنچے ہیں کہ قبیلۂ اوس کے دو آدمی معن بن عدی اور عویم بن ساعدہ دوڑتے ہوئے خانۂ رسالت پر پہنچے۔ ان دونوں آنے والوں کے تعلقات بہت پہلے سے خلافت کے اُمیدوار سعد خزرجی سے کشیدہ تھے۔[1]

---

[1] یہ نام کا تذکرہ صرف عقد الفرید ج ۳ ص ۶۳ اور شرح نہج البلاغہ ج ۲ میں مذکور ہے کسی اور مدرک میں خبر لانے والوں کا نام ذکر نہیں ہے۔ لیکن خود عمر کا بیان ہے کہ جب سقیفہ کو جارہا تھا تو ان دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ جاؤ تم لوگ خود ہی حل کرو۔ میرا خیال ہے کہ عمر یہ نہیں چاہ رہے تھے کہ کسی پر واضح ہو سکے کہ ان آنے والوں نے عمر و ابوبکر کو انصار کے جلسہ کی خبر دی ہے چونکہ ابوبکر کی بیعت کے بعد انصار ایک جگہ جمع ہوئے اور ان دونوں خبر دینے والوں سے

اس آنے والے نے عمر بن خطاب سے کچھ کہنا چاہا لیکن عمر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے لیکن آنے والے کا اصرار بڑھتا رہا اور دم بدم یہ کہتے جا رہے تھے اب بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ آخرکار آنے والے نے عمر کے کان میں کہہ ہی دیا کہ انصار میٹنگ کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی عمر پر بجلی گر گئی۔ آہستہ ابوبکر کو باخبر کیا۔ ان پر بھی گویا بجلی گر گئی۔ دونوں بھاگتے ہوئے انصار کے جلسہ گاہ تک پہنچے۔ راستہ میں ابوعبیدہ جراح بھی ان دونوں کے ہمراہ ہو لیے[1]۔

حضرت علیؑ، بنی ہاشم، کچھ مہاجرین و مسلمان اور وہ لوگ جو حضرت کے بیت الشرف پر جمع تھے۔ انھیں اس اجتماع کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور نہ ہی عمر و ابوبکر کے منصوبے سے باخبر تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیوں یہ مسئلہ جانشینی، جس کا عمر و ابوبکر کو شدید خطرہ تھا، عوام کے سامنے طے نہیں پایا۔ بالخصوص بنی ہاشم اور حضرت علیؑ کو کیوں بے خبر رکھا گیا ـــ کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ اس جلسہ کی خبر بنی ہاشم، حضرت علیؑ اور تمام مسلمانوں کو دی جاتی۔ تاکہ سارے

کو بہت سخت و سست کہا کہ کیوں ہم لوگوں کے اجلاس کی خبر مہاجرین کو دی۔ ان کی اس جاسوسی کو خاصی اہمیت دی۔ انصار کے جواب میں ان دونوں مخبروں نے بھی جواب دیئے لیکن انصار نے رد کر دیا جس پر ان دونوں نے کچھ شعر پڑھے۔ نقل از کتاب الموفقیات تحریر زبیر بن بکار [1] طبری ج ۲ ص ۲۰۸

مسلمان مل کر اس فتنہ کو فرو کرتے جس کی اہمیت کے پیش نظر انصار نے سب سے

پہلے میٹنگ شروع کر دی تھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ انصار کے میٹنگ کی خبر عمر نے کیوں صرف ابوبکر کو دی؟

ان اسرار در اسرار حقائق کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے اور یہ معمّہ بھی ناقابل جواب ہے کہ کیوں عمر نے انصار کے جلسہ کی خبر صرف ابوبکر اور ابوعبیدہ کو دی یہ وہ سوالات ہیں جس پر ابھی کسی محقق نے قلم نہیں اٹھایا ہے، تشنۂ تحقیق ہیں

اس سے انکار نہیں کہ ان لوگوں کو حضرت علیؑ سے اتفاق نہیں تھا جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں ان لوگوں کو خوف تھا کہ کہیں کوئی حضرت علیؑ کی بیعت نہ کر لے۔

اس راز کا سرا مل جائے گا کہ عمر کی کوشش یہی تھی کہ مسئلۂ خلافت ان کے حق میں رہے لہٰذا قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہو حالات پر قابو پالیں تاکہ جس بات کا خوف ہے وہ رونما نہ ہو سکے اور اس طرح انصار کے اجتماع پر بھی غلبہ ہو جائے گا اور کوئی امیر المومنینؑ کی طرفداری میں مدح سرائی بھی نہیں کر پائے گا۔

عمر کا انصار کے اجتماع سے صرف ابوبکر کو باخبر کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان دونوں بلکہ ابوعبیدہ اور سالم مولیٰ حذیفہ کے درمیان سازباز تھی۔ اسی لیے وقت آخر عمر کو قلق تھا کہ آج ابوعبیدہ

اور سالم نہیں ہیں ورنہ خلافت کو انہیں سونپتا در آنحالیکہ سالم قریش

سے نہیں تھا۔

مانا کہ یہ لوگ علی ابن ابی طالب کی جانشینی کے حق میں نہیں تھے تو کیا یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ انہیں انصار کے جلسہ کی خبر دی جاتی کیا بنی ہاشم اور خاندان رسالت میں آپ سے بہتر کوئی تھا۔ علی بن ابی طالب کوئی معمولی فرد نہیں تھے جن کو نظر انداز کرتے ہوئے مشورہ نہ کیا جائے۔

بالفرض اگر ان کے حق میں نص خلافت نہ بھی رہی ہو تو دو بار آپ کو آنحضرت نے اپنا بھائی قرار دیا آنحضرت کے نزدیک آپ کی وہی حیثیت تھی جو موسیٰؑ کے نزدیک حضرت ہارون کی تھی، اوروں کے مقابلہ آپ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھے۔ ہر اس شخص کے حضرت علیؑ مولا تھے جس کے آنحضرت مولا تھے آپ کو اپنے بعد مومنین کا ولی و سرپرست قرار دیا آپ کو اپنا وارث و وصی بنایا، حق آپ کے قدموں سے لپٹا تھا۔

بہر حال فضیلتوں کا ایک پورا باب ہے جس کی روشنی میں عمر کا فریضہ تھا کہ اپنے مشورے میں شریک کرتے۔

مانا کہ وہ آنحضرت کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے لیکن پھر بھی انہیں حالات سے باخبر رکھنا چاہئے تھا تاکہ مشکلات میں ان کے سینہ سپر رہتے۔ کوئی بھی حضرت کی فداکاری، اسلام دوستی شجاعت و ایمان کا منکر نہیں ہو سکتا ہے۔

بہر حال وہ اپنی ان فضیلتوں کے باوجود نظر انداز کئے گئے اور

کاروائی سقیفہ ان سے چھپائی گئی۔ حضرتؑ کو اس وقت خبر ہوئی جب سقیفہ کی کاروائی کے بعد افراد سقیفہ ابوبکر کو مسجد میں عمومی بیعت کے لئے

لائے اور زور دار تکبیر بلند ہوئی۔

میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ میں نے حضرت کے نظر انداز کرنے کی وجہ دریافت کرلی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا پہلو تھا جس نے مجھے مطمئن کر دیا لہٰذا اس کو نذر ناظرین کر دیا۔ میری دانست میں واقعہ سقیفہ کی مخفیانہ کاروائی کی ایک اہم وجہ تھی۔

ممکن ہے کوئی یہاں مجھ سے بہتر سیر حاصل بحث کر کے میری معلومات میں اضافہ کرے یا ثابت کرے کہ میں اپنے نظریات میں غلطی پر ہوں۔

سقیفہ میں مہاجرین کی آمد

جب ابوبکر و عمر اور ابوعبیدہ سقیفہ پہنچے تو انصار آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ مستقبل کی خلافت کے امیدوار سعد بن عبادۃ درد کی تندت چادر لپیٹے بہ عنوان رئیس تقریر کر رہے تھے۔ انصار اپنے گزشتہ کارناموں کا تذکرہ کر کے فخر و مباہات کر رہے تھے اور اپنے انہیں حسنِ عمل کا تذکرہ کر کے اپنی خلافت کو دوسروں پر مقدم و ترجیح دے رہے تھے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک مہاجرین کی ٹولی یعنی یہی عمر و ابوبکر و ابوعبیدۃ وغیرہ جا پہنچے ان کے پہنچتے ہی انصار ہاتھ مل کر رہ گئے اور خلافت کا محاذ سر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مہاجرین کے خوف نے انصار کے سارے

منصوبے پر پانی پھیر دیا۔

مہاجرین نے انصار کو دلدل میں پھنسا دیا یوں بھی بُزدل تھے مہاجرین کے آتے ہی جلسہ کا نقشہ بدل کر رہ گیا اور اب انصار ایک نئے حادثہ کے لئے اپنے کو آمادہ کرنے لگے جو مہاجرین کی آمد سے رونما ہوا۔ لہٰذا جو لوگ قلبی طور سے سعد بن عبادۃ کی جانشینی کے خلاف تھے وہ کھل کر سامنے آ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعد کے حامی و طرفدار دفاعی حیثیت میں آ گئے۔ یہ انصار کے لئے پہلی شکست اور ناکامی تھی۔

مہاجرین جس وقت جلسہ گاہ میں وارد ہوئے، بڑی حقارت سے سعد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ چادر لپیٹے ہوئے کون ہے، ان کی کیا حیثیت ہے؟

سقیفہ اور مسجد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ کے درمیان راستہ میں عمر نے ایک تقریر کا خاکہ تیار کیا تھا، لہٰذا اسے سنانے کے لئے ابوبکر سے قبل کھڑے ہوئے چونکہ عمر کہتے ہیں مجھے خیال تھا کہ کہیں ابوبکر زیادہ سخت و سست نہ کہدیں چونکہ وہ بہت تند لہجہ تھے۔

حاضرین جلسہ کے جذبات بھرے ہوئے تھے لہٰذا وقت کی نزاکت کے پیش نظر بہت ہی نرم گفتاری کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انہیں تصورات کے پیش نظر عمر نے ابوبکر کو بولنے کا موقع نہیں دیا لیکن جب عمر کھڑے ہوئے تو ابوبکر نے انہیں تقریر سے روکا اور خود کھڑے ہو گئے چونکہ ابوبکر کو بھی خطرہ تھا کہ عمر سخت مزاج انسان ہے کہیں

تند لب و لہجہ میں تقریر نہ کر دے۔ لہٰذا تقریر ابو بکر نے کی۔ لیکن عمر کا خیال تھا کہ ابو بکر نے ان سے بھی زیادہ نرم گفتاری کا مظاہرہ کیا۔

ابو بکر کو احساس تھا کہ موجودہ حالات نرم گفتاری کا مطالبہ کر رہے

ہیں۔ سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ اس وقت لب و لہجہ میں تندی و تیزی نہ ہونے پائے لہٰذا جس وقت لوگوں نے سعد بن عبادہ کے خلاف لات مکی شروع کر دی تو مجمع میں سے کسی نے کہا اسے قتل کر دو جس پر عمر نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا ــــ اسے مار ڈالو خدا اس فسادی کو ناس کرے ـــ عمر کے اس جملے پر ابو بکر نے کہا ــــ عمر یہ وقت برہمی کا نہیں ہے۔

میرے خیال میں ایسا نہیں ہے کہ عمر کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ وقت سخت کلامی کا نہیں ہے بلکہ وجہ یہ تھی کہ عمر سمجھ رہے تھے کہ اب تو ان کی جیت ہو چکی ہے اور لوگوں نے ابو بکر کو خلیفہ مان لیا ہے۔ بہر حال عمر کا شمار ابو بکر کے بعد ہو رہا تھا لہٰذا ہو سکتا ہے اس لئے عمر نے سختی کا اظہار کیا ہو تاکہ ابو بکر نرمی سے پیش آئیں۔

ابو بکر کی تقریر کا اثر

جن لوگوں نے قبیلوں اور قوموں پر حکومت و رہبری کی اور اچھی طرح رہبری و سرداری کے حق سے عہدہ برآ ہوئے وہ بہر حال اپنے وقت کے باہوش لوگ تھے یہ اور بات ہے کہ خود انھیں اس کا اندازہ نہ رہا ہو ــــ یہ افراد ایک فطری صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خداداد

صلاحیت اور تجربوں کی بنیاد پر اپنے نظریات سے عوام کو مطمئن کر دیتے ہیں

عمرو ابوبکر بھی انہیں لوگوں میں تھے جو اپنی فطری صلاحیت

کی وجہ سے اس رمز سے آشنا تھے کہ کیونکہ عوامی رجحانات کو قابو میں

 لایا جا سکتا ہے۔ متعدد واقعات اس کے شاہد ہیں[1]

سماجیات کے ماہرین کی نظر میں سقیفہ کا اجتماع مسجد رسول کے اجتماع

سے زیادہ مؤثر تھا۔ چونکہ یہاں جمع ہونے والے صرف ایک مقصد کے لئے

جمع ہوئے تھے اور وہ تھا "جانشینی رسول اکرمؐ" اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں

حاضرین کے جذبات برانگیختہ تھے ہر شخص دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو حقدار

خلافت سمجھ رہا تھا، اور جب لوگ ان احساسات کے ساتھ جمع ہوئے ہوں

ایسے میں ان کے افکار و خیالات پر عقل و منطق سے قابو نہیں پایا جا سکتا ہے

بلکہ بھیڑ بکری کی طرح جہاں ایک جاتا ہے سب چلے جاتے ہیں بلکہ بسا

اوقات وہ فکریں پیدا ہو جاتی ہیں جو بالکل برعکس ہوتی ہیں۔ اس کی

زندہ مثال خود سقیفہ ہی ہے کہ وہاں جمع ہونے والوں نے آپس میں ہاتھا

پائی کی جسے اپنی شجاعت سمجھا اور کبھی ہلکی سی دھمکیوں سے سہم گئے۔

---

[1] جبکہ ایسا نہیں ہے، انصار میں پھوٹ ڈال کر چشم زدن میں مٹھی بھر آدمیوں کے درمیان خلیفہ بن جانا اور پھر تلوار کے زور سے کسی کو بولنے کا موقع نہ دینا یہ ریاست و رہبری کی علامت نہیں ہے بلکہ نامور ڈکیت اور دہشت گرد کی شان ہے" ——— حسینی ———

ایسا جذباتی اجتماع مضحکہ خیز اور طفلانہ اقدام کر گذرتا ہے اور پھر اس کی عقلی توجیہ کے لئے تدبیر و تفکر کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ یہ سب اس لئے ہے کہ انسان جب عقل و خرد کو کام میں نہیں لاتا ۔ ان حالات و خیالات میں اکٹھا ہونے والوں کے جذبات کو ہلکی سی چابکدستی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے ، اور جذبات کا اسیر مجمع خواب غفلت کے پالنوں میں گہری نیند سو جاتا ہے ۔

جن حالات کا میں نے تذکرہ کیا ہے یہ سارے حالات سقیفہ کی کاروائی کے وقت پائے جا رہے تھے اور اسی سے اس نکتہ کو سمجھا جا سکتا ہے کہ ابوبکر و عمر نے اس وقت اس روش کو کیوں اختیار کیا اور یہ راز بھی فاش ہو جاتا ہے کہ انصار کیوں ان کی تقریر سے متأثر ہو کر رہ کر بیٹھے جس نے ان کو ضرب کاری لگائی اور خود انصار ہی کے ذریعہ ابوبکر و عمر نے ان کے اجلاس کو اپنے حق میں کامیاب بنا لیا ۔ اگرچہ یہ صرف دو نفر تھے اور ادھر انصار کی پوری جماعت تھی لیکن عمر و ابوبکر اس کو خاطر میں نہ لائے در آنحالیکہ انصار اپنے کو بہت مضبوط تصور کر رہے تھے ۔ اگر بہت زیادہ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ ابوبکر و عمر کے ہمراہ دو آدمی ابوعبیدہ اور سالم مولیٰ حذیفہ بھی تھے یعنی ان چار آدمیوں نے انصار کی اتنی بڑی پارٹی کے منصوبے کو درہم و برہم کر دیا ۔

ابوبکر کا حربہ

گزشتہ صفحات میں کہہ چکا ہوں کہ ابوبکر نے اپنی تقریر میں انصار

کے دو بڑے گروہ اوس و خزرج کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا یا اوسیوں کے جذبات خزرجیوں کے اس قدر خلاف ہو گئے تھے کہ عنقریب تھا کہ سعد بن عبادہ پر حملہ کر بیٹھیں اس راہ سے ابو بکر نے مجمع کو اپنے قابو میں کیا۔

اگرچہ اوسیوں کو اس کا علم تھا کہ اگر خلافت ان کے درمیان رہ جائے تو ان کا مقابل قبیلہ خزرج زمام خلافت اپنے ہاتھوں میں لے لیگا لیکن جب جذبات نفس پر حاکم ہو جائیں تو پھر عقل و دانش کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

خطبۂ ابوبکر کے اجزاء

ابو بکر کے خطبہ کی تعریف کرتے ہوئے عمر نے کہا: میں نے جو کچھ بولنے کے لئے مسجد و سقیفہ کے درمیان سوچا تھا ابو بکر نے اس سے بہتر تقریر کی تھی۔

ابو بکر نے اپنی تقریر میں اس بات پر روشنی ڈالی کہ ——

- مہاجرین روئے زمین پر وہ پہلا گروہ ہے جس کو عبادت و بندگی کا شرف ملا۔
- مہاجرین وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے خدا و رسولؐ کی تصدیق کی۔
- مہاجرین وہ ہیں جن کا رشتہ رسولؐ خدا سے جڑا ہے اور نبی کے دوستوں میں ہیں جنھیں دوسروں کی بہ نسبت خلافت کا زیادہ استحقاق ہے۔ دنیائے عرب کی گردن پر صرف اسی قریش کا احسان ہے لہٰذا قریش سے خلافت کا مطالبہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے جس کسی نے اپنا استحقاق جتایا وہ ظالم و ستمگار ہے۔

پھر ابو بکر نے حاضرین میں اپنا رخ انصار کی طرف کیا اور ان کے

اسلامی خدمات کا انکار تو نہیں کیا لیکن ان کی خلافت کی تائید نہیں کی اور کہا
کہ خلافت حق مہاجرین کا ہے ہاں وزارت انصار کا حق ہوتا ہے - انصار کو ان

الفاظ میں ابوبکر نے مخاطب کیا تھا -

اے گروہ انصار تمہارے اسلامی و دینی خدمات کا کسی کو انکار نہیں ہے
یہ خدا کی طرف سے شرف ہے کہ تم لوگ اس کے رسول اور اس کے دین کے انصار
و مددگار قرار پائے - آنحضرت نے تمہاری طرف ہجرت کی تمہارے درمیان آج
بھی ان کی محترم بیویاں اور معزز اصحاب موجود ہیں بلاشبہ مہاجرین کے بعد
اگر کسی کو فضیلت و منزلت حاصل ہے تو وہ تم لوگ ہو لہٰذا خلافت ہمارا
حق ہے اور وزارت تمہارا ـــ

متن عربی :

"انتم یا معشر الانصار من لا ینکر فضلکم فی الدین
ولا سابقتکم العظیمة فی الاسلام رضیکم
الله انصاراً لدینه و لرسوله
وجعل الیکم هجرته و فیکم جلة
ازواجه و اصحابه فلیس بعد المهاجرین
الاولین عندنا بمنزلتکم فنحن الامراء
وانتم الوزراء -" (طبری جلد ۳ ص ۲۰۹)

اس ہوش ربا تقریر کے یہ پہلو بھی قابل ملاحظہ ہیں :

- ابوبکر کے اس اقرار سے انصار نے جہاد اسلامی میں حصہ لیا ہے،

پیغمبر اسلامؐ کی مدد کی ہے۔ ان کے بھرے جذبات ٹھنڈے ہو گئے اور مہاجرین متقدمین کی فضیلت کا تذکرہ کر کے ان کے جذبۂ افتخار کو بھی پسپا کر دیا اور ابوبکر کی اس روش نے ان سے بآسانی منوا لیا کہ مہاجرین کو ان پر

تقدم و برتری حاصل ہے۔

• کسی بپھری جماعت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سب سے بڑا حربہ یہی ہے کہ خود اس محرک کا اعتراف کر لیا جائے جس نے ان لوگوں میں مقابلے کی جرائت بخشی تھی ابوبکر نے یہ کام یہاں انجام دیا اور جس افتخار کا انصار حوالہ دے رہے تھے اور جن خدمات مذہبی پر نازاں تھے ابوبکر نے صراحتہً اس کا اعتراف کر لیا۔

• بلاشبہ انصار کے خدمات کا اعتراف کرنا ابوبکر کی دیانتداری ہے لیکن ان کے جذبات کو مجروح کئے بغیر بہت چالاکی سے انھیں باور کرا دیا کہ ان کے وہ خدمات انہیں خلافت نہیں دلا سکتے لیکن ابوبکر نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے لفظ "خطا" یا اس جیسی لفظ کے استعمال سے گریز کیا اور ساحرانہ ڈھب سے بچ کر نکل گئے۔

• اپنی تقریر کو اس پر تمام کر دیا کہ ہمارے نزدیک تم لوگوں کو متقدمین مہاجرین کے علاوہ ہر شخص پر فوقیت و برتری ہے، اس جگہ بھی ابوبکر نے متقدمین کی قید لگا کر انصار کے جذبات کو بھڑکنے نہ دیا کیونکہ اگر سارے مہاجرین کو شریک کر لیا ہوتا تو پھر مسئلہ برابری کا آجاتا اور انصار و مہاجرین کی جنگ چھڑ جاتی لہٰذا متقدمین کی قید

سے انہیں مزید کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ کیونکہ اس قید کو نہ استعمال کیا ہوتا دو[2] متکبر برتری پسند اور قدیمی رقیب و حریف آپس میں برسرِ پیکار ہو جاتے۔ لہٰذا تقریر کے اس قید سے ــــ انصار کو سارے مسلمانوں پر برتری حاصل ہے ــــ انہیں رام بھی کر دیا اور "متقدمین" کو خارج کر کے اپنی بالادستی منوا بھی لی۔

- ابوبکر نے اپنی تقریر میں اس پہلو پر بھرپور زور دیا کہ کوئی انصار کی عظمت تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور متقدمین مہاجرین کی فضیلت ایک بدیہی اور ناقابل شک و تردید چیز ہے اس کو بہت روانی سے کہکر تقریر کو ختم کر دیا یعنی متقدمین مہاجرین کی فضیلت کا تذکرہ ایک ضمنی چیز ہے۔

اور جب ابوبکر نے حاضرین انصار کے دلی جذبات کی ترجمانی کر لی تو ان کے جذبات ٹھنڈے ہو گئے تو سب پھر اپنی اپنی راہوں پر لگ گئے گویا ان کا جو مقصد تھا حاصل ہو گیا۔

انصار کا سقیفہ سے واپس چلا جانا ان کے انحطاط فکری کی ترجمانی کر رہا ہے ورنہ ایک باہوش کے لئے نتیجہ واضح تھا کہ ابوبکر نے ان کے مقاصد کے برخلاف کام کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعات کا یہ مزاج رہا ہے کہ یا وہ ساری باتوں کو مان لیتے ہیں یا سب کو رد کر دیتے ہیں ان میں صحیح و غلط کے شناخت کی قوت نہیں ہوتی۔

ابوبکر کے اس وعدے نے بھی ان کو مطمئن کر دیا کہ خلیفۂ وقت

بغیر اپنے وزیر کے مشورے کے کوئی کام انجام نہیں دے گا۔ ہر مسئلہ میں انصار کی شمولیت و شرکت رہے گی۔ اس طرح وزارت کے سبز باغ نے انصار کے دلوں سے یہ خوف بھی نکال دیا کہ انصار ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی کریں گے، گویا یہ وعدہ ایک خواب آور گولی تھا جسے پا کر انصار بے فکری کے گہوارے میں سو رہے، انہوں نے سوچا بھی نہیں کہ یہ صرف

وعدہ ہے جو وفا نہیں کیا جائے گا۔

- ابو بکر کی تقریر کے کلمہ "اوّلین" نے بھی بڑا اثر کیا چونکہ اگر یہ قید نہ ہوتی تو انصار قابو میں آنے والے نہ تھے چونکہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور انصار کو متقدمین مہاجرین کے شرف کا انکار نہیں تھا وہ مانتے تھے مہاجرین متقدمین ان سے پہلے خدا شناس ہوئے۔

خود زمانۂ پیغمبر اسلام کا واقعہ ہے کہ جب انصار و مہاجرین اپنی اپنی بڑائی و برتری کا گن گا رہے تھے تو آنحضرتؐ نے فرمایا تھا۔

"یہ جاہلیت کا انداز ہے اس کو چھوڑ دو۔"

لیکن بات یہاں تک بڑھی کہ عنقریب تھا لفظی جنگ خون خرابے میں بدل جائے تفصیل بخاری میں موجود ہے۔[1] ابو بکر کی اس قید نے یہ بھی حاضرین پر واضح کر دیا کہ خلافت کے لئے ان کے علاوہ ان کے دونوں دوست عمر و ابو عبیدہ بھی مناسب ہیں۔

- تقریر کے لفظ "عندنا" (میرے نزدیک) کی سحر انگیزی سے بھی

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۶۵ ج ۳ ص ۱۲۶

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابوبکر نے خون کے پیاسے انصار و مہاجرین کی دیرینہ رقابت کو مہار کرنے کے لئے اپنے کو ایک قاضی و حَکَم کی حیثیت سے پیش کیا اور خود کو دونوں پارٹیوں سے علیٰحدہ کر لیا تاکہ جو چیز دونوں قبیلوں کے مفاد میں ہو اس کو انجام دے۔ لہٰذا ابوبکر کی اس قید "عندنا" نے انصار کے مجمع پر ان کی شخصیت کو اور بڑھا دیا اور دونوں پارٹیوں کے لئے زعیم و رئیس بن کر سامنے آئے۔

اگر ابوبکر نے اپنے کو مہاجرین کی ایک فرد قرار دیتے ہوئے پیش کیا ہوتا تو انصار قطعاً انہیں تسلیم نہیں کرتے اور ابوبکر کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوتی۔

عوام الناس کی یہی فطرت ہے کہ وہ دل کو لبھا دینے والے خالی دعووں کا ثبوت نہیں مانگتے لیکن متأثر ضرور ہوتے ہیں۔

بلاشبہ ابوبکر کے وعدۂ وزارت میں کوئی سچائی نہیں تھی لیکن جادو بیانی تھی کہ انصار مسحور ہو گئے ورنہ "عندنا" میں ضمیر جمع کی بازگشت پورے مہاجرین کی طرف تھی جس کی ایک فرد خود ابوبکر تھے۔ سوال یہ ہے کہ ابوبکر کو مہاجرین نے کب اپنا نمایندہ چُنا تھا جو انہوں نے سقیفہ میں "عندنا" سے مہاجرین کی نمائندگی فرمائی۔

بہرحال باوجودیکہ ابوبکر خود مہاجر تھے، انہوں نے مہاجرین کو انصار پر حکیمانہ انداز سے برتری بخشی اور زمام خلافت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ حاضرین عقل سے بے بہرہ ہو کر دل و جان سے مقرر کے

ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے۔

تیرا میرا

ابوبکر کی تقریر ختم ہوئی ۔ حاضرین پر اس کے اثرات کی ایک جھلکی بھی دکھاتا چلوں ۔ مجمع دم بخود تقریر سنتا رہا، صرف ایک حباب بن منذر تھا جس نے ابوبکر کے بیان کی مخالفت کی۔ لیکن مخالفت نتیجہ خیز نہ ہوئی ۔ اگرچہ ابتداء میں انہوں نے بہت استدلالی گفتگو کی لیکن خود مہاجرین کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور ان کی تقریر اس وقت دفن ہو کر رہ گئی جب انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ — خلافت انصار و مہاجرین کی مشترکہ نمائندگی سے چلائی جائے — اس تجویز سے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی[1]۔

اگرچہ حباب اپنے کو شدید متعصب و مخالف ظاہر کر رہے تھے تاکہ اس طرح مخالف کو مغلوب کر سکیں۔ لہٰذا بڑی آن بان سے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا — زمام خلافت کو اپنے ہاتھوں میں لے لو، لیکن فقرے کے غلط اثرات مرتب ہوئے جس کی طرف عمر کی تقریر میں اشارہ ہو گا۔

---

[1] تفصیل گزشتہ صفحات پر گذر چکی ہے۔

عمر کی تقریر

حباب بن منذر کے جواب کے لئے عمر کھڑے ہوئے اور کہا :

"ممکن نہیں ہے کہ دو خلیفہ بیک وقت حاکم ہوں خدا کی قسم عرب قطعاً اس بات کو پسند نہیں کریں گے ۔ خلافتِ رسولؐ اس قبیلے کے پاس رہے جس قبیلے سے پیغمبر اسلام نہ ہوں ، ہاں عربوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ گروہ خلافت کی باگ ڈور تھام لے نبی اکرم کا خاندانی ربط جس سے رہا ہو ۔ اور اگر کوئی اس سے انکار کرے تو میرے پاس اس کو قائل کرنے کی دلیل موجود ہے ۔

کس کو حق ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی جانشینی میں ہم سے مقابلہ کرے چونکہ ہم لوگ آنحضرت کے افراد خاندانی اور آپ کے دوست و مخلص ہیں ۔

جو ہم لوگوں کے علاوہ مطالبہ خلافت کرے وہ گناہگار ، ظالم ، اور گرداب ہلاکت میں پھنسا ہے ۔"

اگرچہ یہ تقریر بھی نرم لہجہ میں انجام پائی لیکن ابوبکر کے لب و لہجہ کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ یہاں عمر نے حباب کو اپنا دشمن و خلافت کے غلط دعویدار کی حیثیت سے قرار دیا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس میں بھی ایک سازش تھی ابوبکر نے اپنے کو ایک "قاضی و حَکَم" کی حیثیت سے اس لئے پیش کیا تاکہ عمر اپنے کو مہاجرین کا نمائندہ بنا کر پیش کرسکیں.

اس جگہ عمر نے یہ صراحت نہیں کی کہ خلافت کی نص کسی کے لئے وارد ہوئی ہے بلکہ صرف تین نکتوں کی طرف اشارہ کر کے گذر گئے:

الف۔ مہاجرین آنحضرت کے اہل خاندان اور دوست ہیں،

ب۔ عربوں کو ان کی خلافت پسند نہیں جو خاندان رسولؐ سے نہ ہو،

ج۔ آنحضرت کا جانشین خود آپ کی قوم و قبیلہ کی فرد ہونا چاہیئے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"احتجوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ"

"یعنی شجرۂ نبوت سے استدلال کیا اور ثمرہ ولایت کو نظر انداز کر دیا۔"

عمر کے جواب میں حباب بن منذر کھڑے ہوئے اور کہا:

"اے انصار! خلافت کو اپنے ہاتھ میں لے لو عمر اور ان کے ساتھیوں کی بات پر توجہ نہ دو تاکہ تمہارے حق خلافت کو تم سے چھینا نہ جا سکے۔ اگر یہ لوگ تمہارے دعووں کو نہیں مانتے تو ان کو نکال بھگاؤ۔ بہر حال ان کے بجائے تم کو خلیفہ و جانشین ہوتا ہے۔

خدا کی قسم خلافتِ رسولؐ کے تم زیادہ مستحق ہو، چونکہ تمہاری تلواریں تھیں جنھوں نے مخالفین کو دین اسلام کا مطیع بنایا۔

میں خلافت کا مددگار، اور سچا ناصر ہوں۔

میں ترائی کا شیر ہوں۔

اگر تم آمادہ ہو تو تلوار کو میان سے نکال دو اور جو ہماری

مخالفت کرے گا اس کا سر توڑ دوں گا۔"

حباب کی یہ تقریر اس کے ارادوں کی ترجمان اور زمانہ جاہلیت کی خو بو کی حکایت کر رہی ہے۔ جس وقت عمر نے یہ جواب سنا برجستہ کہا:

"خدا تجھے قتل کرے"

عمر نے اس جگہ یہ نہیں کہا کہ لوگ تجھے قتل کریں بلکہ کہا خدا تجھے قتل کرے تاکہ حباب پر واضح ہو سکے کہ خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

حباب نے عمر کے جواب میں کہا:

"تو اپنے کو قتل کر ڈال"

حباب کا جواب بھی اس کی عکاسی کر رہا ہے کہ جب استدلال کمزور ہوتا ہے تو غیظ و غضب میں انسان تیرے میرے پر اتر آتا ہے

حباب بن منذر جس مجمع میں یہ خطاب کر رہے تھے۔ بہر حال وہ اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ انداز تقریر جسمیں زمانۂ جاہلیت کی خو بُو پائی جا رہی ہو۔ اس کے بعد توقع نہیں تھی کہ انصار اپنے مقصد میں کامیاب ہو پاتے۔ لہٰذا اگرچہ حباب نے اپنے دانست میں یہ خیال کیا کہ وہ سعد بن عبادہ کے حامی ہیں۔

لیکن بباطن خود یہی تقریر ان کے حیلہ کی ناکامی کا سبب ہوئی اور غیر شعوری طور سے خلافت ابوبکر تک منتقل ہو گئی جنہیں اس نکتہ سے آگاہی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں کیونکر اترا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ

انصار کی شکست کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب حباب کے چچا زاد بھائی بشیر بن سعد خزرجی نے مجمع سے اٹھ کر یہ تقریر کی:

"اے گروہ انصار! اگر ہمیں یہ شرف ہے کہ ہم نے اوروں سے پہلے اسلام قبول کیا، کفار سے جنگیں کی تو یہ سب کچھ خدا کی خوشنودی، آنحضرت کی اتباع اور خود اپنی فلاح وبہبود کے لئے تھا لہٰذا ہمارے سے لئے قطعاً زیبا نہیں ہے کہ اپنے ان کارناموں کو اپنے لئے فخر ومباہات کا ذریعہ بنائیں۔ ہمیں دنیا کی عزت نہیں چاہئے خدا ہمارا ولی نعمت ہے اور وہی بس کافی ہے۔

بلاشبہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ قبیلۂ قریش سے تھے لہٰذا ان کی قوم ان کی جانشینی کی ہم لوگوں سے زیادہ حق دار ہے۔ مجھے قطعاً یہ گوارہ نہیں ہے کہ ہم مسئلۂ خلافت میں قریش سے جنگ وجدل کریں خدا سے ڈرو! خلافت کیلئے ان لوگوں سے برسر پیکار نہ ہو۔"

بشیر بن سعد کی پوری تقریر اسلامی آداب و اطوار سے آراستہ رہی اور تقریر کے آہنگ نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ابو بکر کی تقریر کا کس قدر بشیر پر اثر پڑا تھا کہ خود انصار کی فرد ہونے کے باوجود اپنے کو انصار کی حمایت سے الگ کر لیا اور سب سے پہلے ابو بکر کی بیعت کر ڈالی۔

میرا خیال ہے کہ اس بیعت کرنے میں سعد بن عبادہ کی مخالفت کا عنصر شاید نہ رہا ہو لیکن اتنا ضرور ہے جس وقت بشیر نے ابو بکر کی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا تو حباب بن منذر نے چیخ کر کہا:

"اے بشیر! تم نے بے وفائی کی تم کو کیا حق پہنچتا تھا کہ تم ان کی بیعت کرو،

تم نے بیعت کر کے آپس میں پھوٹ ڈال دی کیا تم کو اپنے چچا زاد بھائی سے رقابت و حسد تھی جو تم نے ابو بکر کی بیعت کی؟"

بشیر نے حباب کے جواب میں کہا:

"خدا کی قسم ایسا نہیں ہے میں نے یہ نہیں چاہا کہ خدا نے جن لوگوں کو مستحق خلافت قرار دیا ہے ان سے اختلاف کروں۔"

بہر حال اگر سو فیصد نہ سہی تو بہت حد تک بشیر اپنے دعوے میں صحیح تھا چونکہ حاضرین پر ابو بکر کی تقریر کا بھرپور اثر ہو چکا تھا اس کے بر خلاف حباب کے انداز خطاب نے لوگوں کو انصار کی طرف سے

متنفر و بدظن کر دیا تھا لہٰذا جلسہ گاہِ انصار سے ابوبکر کی خلافت کا اعلان ہوگیا ۔ اور اس پیش قدمی کا سہرا بشیر بن سعد پر رہا ۔

مہاجر کی جیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوبکر کی تقریر نے حاضرین کو اپنا طرفدار بنالیا تھا باوجودیکہ انصار و مہاجر کے درمیان رقابت تھی لیکن اس کے باوجود ابوبکر کی بعیت کرلی ۔

ابوبکر نے گزشتہ خطبہ میں صراحت کردی تھی کہ اگر کسی نے خلافت کا دعویٰ کیا تو دوطرفہ حملہ کے شکار ہوگا یعنی ایک طرف سے مہاجرین حملہ کریں گے اور دوسری طرف سے خود انصار کا دوسرا دھڑا مخالفت کرے گا ۔ ابوبکر کے اس فقرہ نے انصار کے درمیان سوئی ہوئی عداوت کو جگا دیا ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قریب والوں کی رقابت دور والوں کی بہ نسبت زیادہ مؤثر ہوتی ہے اس کا مظاہرہ بشیر کی تقریر سے ہوا ۔

ابوبکر اپنے تئیں یہ سمجھ چکے تھے کہ حاضرین ان کی تقریر سے منقلب ہو چکے ہیں ، مجمع کے احساسات و نفسیات پر ان کی تقریر کا غلبہ ہے لہٰذا ایسی خود رفتگی کے ماحول میں کیونکر اپنے منصوبہ کو عملی کیا جاسکتا ہے لہٰذا اپنے دوساتھیوں عمر و ابو عبیدہ میں سے ایک کو خلیفہ کی حیثیت سے پیش کیا اور حاضرین سے کہا :

"میں نے ان دو آدمیوں کو تمہارے لئے خلیفہ کی حیثیت
سے منتخب کیا ہے تم ان میں سے جس کسی کی چاہو بیعت
کر لو۔"

یہاں پر بھی ابوبکر نے اپنے کو بعنوان حَکَم و قاضی کے پیش
کیا تاکہ دونوں گروہوں پر برتری باقی رہے اور حاضرین کو یہ باور کرا دیں
کہ انکا اقدام طرفین کی فلاح کے پیش نظر ہے۔

میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ عوام الناس میں خود سوچنے
سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی سقیفہ کے حاضرین بھی اسی زمرہ میں تھے ابوبکر
کے مطالبہ بیعت کے باوجود سب خاموش رہے نہ یہ طے کر سکے کہ
بیعت کرنی چاہیئے یا نہیں نہ یہ طے کر سکے کہ کس کی کرنی چاہیئے منتظر تھے
کہ یا خود ابوبکر کا اشارہ ملے جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا
رکھا ہے یا کسی اور اسی جیسے صاحب ارادہ کا اشارہ۔

اگر ابوبکر کے بیان کے بعد عمر و ابوعبیدہ میں سے کوئی ایک
اٹھ کھڑا ہوتا تو شاخسانہ سقیفہ حل ہو جاتا۔ لیکن ابوبکر نے مسئلہ کو دو
کے درمیان دائر کر کے لیت ولعل میں ڈال دیا تھا گویا اس چال سے
وہ حالات کو اپنے لئے سازگار کر رہے تھے۔ یا شاید تینوں کے درمیان
طے ہو گیا تھا کہ پہلے خلیفہ ابوبکر ہوں گے پھر عمر پھر ابوعبیدہ اسی لئے
تو عمر کو وقت آخر حسرت تھی کہ کاش ابوعبیدہ ہوتے تو مسئلہ
خلافت حل تھا۔

ابوبکر کی پیشکش کے بعد عمر نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"خدا کی قسم میں آپ کی موجودگی میں قطعاً بیعت نہیں لے سکتے آپ ہاتھ بڑھائیں ہم لوگ بیعت کریں"۔

اور مزید سوال و جواب کا موقع نہیں دیا بلکہ آگے بڑھ کر ابوبکر کی بیعت کر لی۔ ابوبکر نے بھی بیعت سے انکار نہیں کیا۔

جس وقت بنام بیعت خلافت کا یہ سودا ہو رہا تھا، بشیر ابن سعد نے فوراً بڑھ کر اپنا ہاتھ عمر اور ابوبکر کے درمیان قرار دیا تاکہ اوّلیت کا شرف عمر کو نہ ملنے پائے یا مہاجرین پر اس کا اخلاص آشکار ہو جائے۔

اس طرح کے افعال مدہوش عوام کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں جو عارضی اثرات سے متأثر ہو کر عقل و خرد کو کام میں نہیں لاتے ۔۔ سقیفہ کی یہ کاروائی اسی عوامی بے خبری کی مثال ہے جو ابوبکر کی تقریر سے مسحور ہو چکے تھے۔

- تقریر کا وہ اثر ہوتا ہے کہ عقل سوچنے سے قاصر اور دلیل بے اثر ہو جاتی ہے۔
- تقریر میں وہ جادو ہے کہ مقرر کی زبان سے نکل کر حاضرین کے دل کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔
- تقریر میں وہ جاذبہ ہے کہ الٰہی روشنی اور ساحرانہ رَو بنکر دلوں میں اتر جاتی ہے۔
- تقریر کبھی غیظ و غضب کا بھیانک ترین طوفان پیدا کر دیتی

ہے تو کبھی بپھرے جذبات کو ایسا ٹھنڈا کر دیتی ہے کہ اگر جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو انسان چوں نہیں کر سکتا ہے اور وہ سب کچھ کر بیٹھتا ہے جس کا مفرر مطالبہ کرتا ہے۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے عمر کو اس کا اندازہ تھا کہ کیونکر مہاجرین وقت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لہٰذا جیسے ہی موقع ملا فوراً ابوبکر کو جانشینی رسول کے لئے پیش کیا اور بغیر کسی ردّ و قدح و خوف و ہراس کے انکی بیعت کے لئے لپکے ورنہ بیعت کا اس آسانی سے انجام پانا مشکل تھا۔

یہ سوچنے کی جگہ ہے ایک ایسے گھر میں جہاں ایک مضبوط پارٹی ایک ایسی حکومت کی تشکیل کے لئے جمع ہوئی ہو جس کی گرفت پوری اسلامی دنیا پر ہو سکے، اس میں چار آدمیوں کا مخالف کی حیثیت سے شریک ہونا اور ان سے اپنے نظریات و مقاصد کو تسلیم کرا لینا جب کہ پارٹی لیڈر (سعد بن عبادہ) خلافت کے امیدوار کی حیثیت سے موجود ہے۔ ان آنے والوں نے نہ اس سے مشورہ لیا اور نہ کچھ پوچھا اس طرح امور خلافت کی مہار اپنے ہاتھ میں لے لی گویا سب چیز پہلے سے عمر و ابوبکر کے درمیان طے تھی۔ یہ ایک تہوّرانہ اقدام تھا جو عمر سے سرزد ہوا۔ عمر نے بیعت ابوبکر میں اسی لئے عجلت کی چونکہ انہوں نے یہ پہلے سے طے کر لیا تھا کہ خلیفہ مہاجرین میں سے بنایا جائے گا۔

اسی لئے تو حاضرین نے بھی چون وچرا نہیں کی بلکہ قبیلہ اوس نے بغیر کسی دباؤ کے اسید بن حضیر کی سرپرستی میں گرتے پڑتے ابوبکر

کی بیعت کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعد اور چند اس جیسے افراد مثلاً حباب بن منذر و قیس بن سعد کے علاوہ سارے انصار نے ابو بکر کی بیعت کر لی۔

سچ ہے رقابتیں اور دشمنیاں اسی طرح رنگ لاتی ہیں جس طرح خاشاک کے ڈھیر میں چنگاریاں اور تاروں میں دوڑتی ہوئی بجلیاں اپنا اثر دکھاتی ہیں — اوس و خزرج کے درمیان کی نہفتہ رقابتوں نے سقیفہ میں اپنا اثر دکھایا۔

عمر نے بیعت ابوبکر میں بے پناہ تیزی دکھا کر لوگوں میں بیعت کا کرنٹ دوڑا دیا کہ انصار بیعت کے لئے گرے پڑ رہے تھے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ ہم پہلے اس شرف سے بہرہ مند ہوں۔ چشم زدن میں وہ کایا پلٹ ہوا کہ خزرجیوں کا رئیس بلکہ کل انصار کا رئیس سعد بن عبادہ جو چند لمحے قبل امت اسلامیہ کی خلافت کا امیدوار تھا مجمع کے لاتوں اور مکّوں سے قریب مرگ ہوگیا، کسی طرح لوگ بچا کر ناکامیوں اور درد و کرب کی چادر میں لپیٹ کر گھر لائے۔

حالات کی کایا پلٹ صرف اس لئے رونما ہوتی ہے کہ عوام میں استحکام فکری نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ وہ اپنے کو خواہشات کی گرفت سے آزاد کر پاتے اور نہ ہی اس نظم و ضبط کو برقرار رکھ پاتے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

عوام عارضی اثرات سے متأثر ہو کر سب کچھ بھول جاتی ہیں

لیکن حباب بن منذر نے جب حالات کو بدلتے ہوئے دیکھا تو فوراً نیام سے تلوار نکال لی اور عمر نے اس کے حملہ کو روکا جس سے حباب کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی جسے عمر نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ حباب نے اسی تیش میں آکر نیام سے ان لوگوں کی پٹائی کرتے رہے جو بیعت کر رہے تھے۔

کھیل بگڑ چکا تھا ساری کوشش کے باوجود حباب اس گناہ و سرکشی سے اپنی قوم کو روک نہ سکے، آخر کار ابوبکر خلیفہ بن گئے۔ واقعہ سقیفہ کے بعد اس کے اور اس کی قوم کے لئے "دبّ ساع لقاعد" کی ضرب المثل بن گئی۔

اے کاش اس وقت میں ہوتا تو دیکھتا حباب کا کیا عالم رہا ہوگا کف منھ سے جاری، سانس اکھڑی ہوئی، غیظ و غضب میں اپنے ہاتھوں کو بھنبھوڑ رہے ہوں گے اور شرارۂ غضب نے حباب کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوگا۔

ایک سوال حباب کے سامنے تھا کہ ساری کوششوں اور مار پیٹ کے بعد بھی لوگوں کو بیعت سے نہ روک سکے خود اپنے ضمیر کو کیا جواب دے اور اپنی قوم کو کیوں کر مطمئن کرے۔

حقیقتاً اگر حباب تہذیب جدید سے آراستہ ہوتا تو اس ذلت و رسوائی سے نجات کے لئے خودکشی کر بیٹھتا۔

آخر کلام

واقعۂ بیعت کے تفصیلی مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابوبکر کی جانشینی

کہا حقہ صحیح نہ تھی۔ بقول عمر بے سوچے سمجھے روا روی میں انجام پاگئی۔ خدا اس خلافت کے شر سے بچائے رکھے، محمد فرید ابی حدید نے اپنے مقالے "نظرۃ فی نظام بیعۃ الخلفاء" میں جس مطلب کو پیش کیا ہے وہ قابل تائید و تصدیق ہے[1]۔

ابوبکر کی بیعت اس تیزی سے انجام پائی کہ نہ حاضرین کو سوچنے کا موقع ملا اور نہ مخالفین یعنی سعد بن عبادہ اینڈ پارٹی کو اپنے استحقاق پر دلیل لانے کا وقت مل سکا۔

درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی ناگہانی موت نے اس ناگہانی خلافت کے مواقع فراہم کر دئیے، ابوبکر نے اوس و خزرج کے دیرینہ کینوں کو ہوا دیکر بھی اس جانشینی کو مضبوط کر لیا، دوسری طرف تر کارِ سقیفہ کی عامیانہ ذہنیت نے اس بیعت کو رسمیت بخشی۔ لہٰذا اگر کوئی ناقد سقیفہ کے اجتماع کو غیر معتبر اور اس اجتماع کے ذریعہ وجود پانے والی خلافت کو مسترد کرے تو تعجب نہیں ہے چونکہ خود عمر بن خطاب نے کہا تھا:

"سقیفہ کے انداز پر اگر کسی نے بیعت کا مطالبہ کیا تو نہ بیعت لینے والے کی کوئی حیثیت ہے اور نہ بیعت کرنے والے کی۔"

---

[1] الرسالۃ المصریۃ شمارہ ۱۱

کہ حقہ صحیح نہ تھی۔ بقول عمر بے سوچے سمجھے روا روی میں انجام پا گئی۔ خدا اس خلافت کے شر سے بچائے رکھے، محمد فرید ابی حدید نے اپنے مقالے "نظرة فی نظام بیعة الخلفاء" میں جس مطلب کو پیش کیا ہے وہ قابل تائید وتصدیق ہے[1]۔

ابوبکر کی بیعت اس تیزی سے انجام پائی کہ نہ حاضرین کو سوچنے کا موقع ملا اور نہ مخالفین یعنی سعد بن عبادہ اینڈ پارٹی کو اپنے استحقاق پر دلیل لانے کا وقت مل سکا۔

درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی ناگہانی موت نے اس ناگہانی خلافت کے مواقع فراہم کر دئیے، ابوبکر نے اوس و خزرج کے دیرینہ کینوں کو ہوا دیکر بھی اس جانشینی کو مضبوط کر لیا، دوسری طرف تر کارِ سقیفہ کی عامیانہ ذہنیت نے اس بیعت کو رسمیت بخشی۔ لہٰذا اگر کوئی ناقد سقیفہ کے اجتماع کو غیر معتبر اور اس اجتماع کے ذریعہ وجود پانے والی خلافت کو مسترد کرے تو تعجب نہیں ہے چونکہ خود عمر بن خطاب نے کہا تھا:

"سقیفہ کے انداز پر اگر کسی نے بیعت کا مطالبہ کیا تو نہ بیعت لینے والے کی کوئی حیثیت ہے اور نہ بیعت کرنے والے کی۔"

---

[1] الرسالة المصرية شمارہ ۱۱

اگر کسی نے سقیفہ میں حق امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالب کا دفاع نہیں کیا تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ چونکہ ان لوگوں پر تباہ کن موت چھائی ہوئی تھی وہ کسی طرح حق امیرالمومنین کا دفاع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جن لوگوں کو سقیفہ والوں پر تسلط و غلبہ تھا ان کی بھرپور کوشش تھی کہ جلسہ کی کاروائی حضرت علیؑ کے حق میں نہ جانے پائے۔

لہٰذا ایسی صورت حال میں یہ تصور ہی نہیں کرنا چاہئے کہ یہ جمع ہونے والے اس اجتماع کی آپ کو خبر دیتے اور اگر کچھ یا سارے انصار نے یہ کہا کہ ہم —— غیراز علیؑ کسی کی بیعت نہیں کریں گے —— تو بصرہ کی خرابی کے بعد کہا ہے کیونکہ سقیفہ میں جمع ہونے والی جماعت کا احساسِ دینی مُردہ ہو چکا تھا اور اس احساس کے مردہ ہونے کی وجہ وہی ذہنی پستی اور ابوبکر کی جادو بیانی تھی جس کی طرف روشنی ڈال چکا ہوں، ساتھ ہی ساتھ سقیفہ میں انصار کے اجتماع کی اساس خلافت کی طمع اور رقیبوں کا خوف تھا لہٰذا اس "خوف و طمع" نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنے فرائض دینی سے متعلق غور و فکر کر سکیں لہٰذا منصوبے میں شکست کے بعد فطری طور سے اسی دھڑے سے جا ملے جس کو ان پر کامیابی ملی تھی اور گرتے پڑتے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر ڈالی۔

حاضرین سقیفہ کے دینی و مذہبی فقدان کا ثبوت ان دو باتوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو وہاں پر طے پائی تھیں:

الف۔ انصار خلافت کے اہل نہیں ہیں — بلکہ

ب ۔ وزارت ان کا حق ہے ۔

لیکن پہلی تجویز کو خود ابوبکر نے یہ کہکر کالعدم قرار دیدیا کہ — کاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے سوال کیا ہوتا کہ ان کے بعد کون خلیفہ ہوگا — وزارت کا زبانی وعدہ بھی سقیفہ کی فضا میں گم ہوکر رہ گیا نہ ابوبکر کے عہد میں انصار کو وزارت ملی اور نہ ابوبکر کے بعد والے دور میں — بلکہ زمانہ عباسی تک انھیں کسی دور میں وزارت نہیں ملی۔

سقیفہ کے گرد وپیش کا جائزہ لینے کے بعد اب نتیجہ نکالنا میرے لئے آسان ہوگیا کہ آیۂ کریمہ افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم[1]۔ سے مراد یہی سقیفہ والے ہیں کیونکہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ بعد کے خلیفہ کے لئے کوئی نص نہیں تھی تو سقیفہ کا انتخاب ضابطۂ اسلامی اور نص رسول اکرمؐ کے مخالف تھا، اس سے زیادہ کفر کی طرف واپسی کی واضح مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

سقیفہ میں شروع سے آخر تک اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ نص رسولؐ پر کوئی غور وخوض کرسکے۔ سکنڈوں اور منٹوں میں سب کچھ انجام پاگیا۔

اپنی کتاب کے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ میری اس تحلیل وتفسیر کی روشنی میں واقعہ سقیفہ کا جائزہ لیں یہ واقعہ خود خلافت

---

[1] اگر رسول مرجائیں یا قتل کردیے جائیں توتم الٹے پاؤں کفر کی طرف پلٹ جاؤگے۔

حضرت علیؑ کے اثبات کے لئے معاون و مددگار ہے - کیونکہ حضرت علیؑ کی فضیلت میں بے شمار نصوں کو یہ کہکر رد کر دیا جائے کہ وہ خلافت کی تعین کے لئے نہیں تھیں بلکہ آپ کی مدح و ثنا میں آئی تھیں اور سقیفائی اجلاس خلوص نیت سے شرعی ضابطہ سے وجود میں آیا، خلافت کو حضرت علیؑ سے چھینا مقصود نہیں تھا - اس فرض کے بعد بھی حضرت علیؑ کو آنحضرت سے بے پناہ نسبتیں تھیں ـــــ علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی ـــــ تو ان فضائل کے پیش نظر بھی آپ کو اور آپ کے اہلبیت کو سقیفائی جلسہ میں آگے آگے رکھنا چاہیئے تھا -

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہ آپ کو دعوت دی نہ مشورہ لیا گیا بلکہ شروع سے آخر تک یہ کوشش رہی کہ آپ کو اور بنی ہاشم کو اس اجتماع کی خبر نہ ہونے پائے - ایسا لگتا ہے یہ حضرات یا مدینہ میں نہیں تھے یا ان کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی -

چوتھی فصل

علیؑ اور خلفاء

امامؑ پر دباؤ

تاریخی شواہد کی روشنی میں حضرتؑ کو سقیفہ کے اجلاس کی خبر نہیں تھی
طبری کے بیان کے مطابق جب مہاجرین کی سہ نفری جماعت ابوبکر، عمر
اور عبیدہ ان سے جاملی آپ کو اس کی بھی خبر نہیں تھی۔

سقیفائی اجلاس کی آپ کو اس وقت خبر ہوئی جب وہاں کا مجمع
نعرے لگاتا، شور مچاتا مسجد نبی کی طرف بڑھا ہے، عمر کمر بستہ ہاتھ
میں کھجور کی چھڑی لئے ہوئے عوام کو بیعت کی ترغیب دلا رہے تھے۔

دوسرا دن ہو چکا تھا کہ حضرت امیرالمومنین رسولؐ خدا کی تجہیز و
تکفین کی مصروفیت و مشغولیت کی وجہ سے بیت الشرف سے باہر نہیں
آئے تھے جب مسجد سے مجمع کی نعرۂ تکبیر سنی تو حقیقت حال سے باخبر ہوئے

نہ صرف یہ کہ سقیفہ کے ارباب اقتدار نے حضرت سے مشورہ نہیں
کیا بلکہ سقیفہ کی چٹ پٹ کاروائی کو حضرت پر مسلط کر رہے تھے صورت
حال سے صاف ظاہر تھا کہ علیؑ سے انتقام لے رہے ہیں ورنہ جس وقت
عمر کو انصار کے اجتماع کی خبر ملی تھی فوراً خاموشی سے ابوبکر کو باخبر کیا اور

دوڑتے ہوئے سقیفہ کی طرف چل پڑے اگر یہ لوگ اپنی نیتوں میں مخلص تھے تو کیوں نہیں عمر نے اسی خاموشی سے ـــــ حضرت علیؑ کو خبر دی جس طرح ابو عبیدہ اور ابوبکر کو مطلع کیا تھا۔

اگر سقیفہ میں انصار کا اجتماع کسی فتنہ کا پیش خیمہ تھا تو کیا امام سے بڑھ کر کوئی موجود تھا جو اس فتنہ کو فرو کرتا۔

اس سے زیادہ حیرت تو یہ ہے کہ اگر مشورہ کے لئے نہیں بلایا تو بیعت کے لئے بھی اس وقت تک نہیں بلایا جب خلافت ابوبکر کو مضبوط نہیں کر لیا

بہر حال ان حضرات کو چاہئے تھا کہ کسی کے ذریعہ حضرت کو خبر کرتے لیکن واضح ہے کہ ان لوگوں کی نیتوں میں فتور تھا ان کو یقین تھا کہ حضرت ان کی کارروائیوں پر راضی نہ ہوں گے، بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حضرت علی کے طرفداروں کو ڈرایا دھمکایا گیا اور گروہ در گروہ لوگوں کو بیعت کے لئے بلایا جا رہا تھا۔ لیکن حضرت علی کے اصحاب و بنی ہاشم اس کے باوجود سید عرب حضرت ختمی مرتبت کی تجہیز و تکفین میں لگے رہے۔

سقیفہ کی کارروائی دین و دیانت سے خالی تھی اور اس کا مقصد حضرت علی کو حق سے محروم کرنا تھا اس کا ثبوت طبری کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"قبیلۂ اسلم" آیا اور اس نے ابوبکر کی بیعت کی اور لوگوں نے بھی بیعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "ابوبکر کا پہلو مضبوط ہو گیا۔

اس جملہ پر ضرور غور فرمائیں ـــــ ابوبکر کے مقابلہ میں وہ کون پارٹی تھی جس کے مقابلہ میں ابوبکر کا پلہ بھاری ہو گیا ـــــ کیا وہ انصار تھے؟

نہیں! چونکہ انصار نے تو ابوبکر کی بیعت کر لی تھی، اور اگر سعد بن عبادہ یا اس کے بیٹے و بھتیجے نے بیعت نہیں کی تھی تو ان کی اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی، طبری کا یہ اشارہ ـــ حضرت علی اور آپ کے اصحاب

کی طرف ہے۔

اسی لئے جب مجمع کی تکبیر کے بعد حضرت علیؑ کو واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے ان لفظوں میں اعتراض فرمایا:

"احتجوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ"

شجر رسالت کو لے لیا اور ثمر امامت کو چھوڑ دیا۔

کاروائی سقیفہ امام علیؑ کی نظر میں

اگرچہ حضرت نے اپنی خلافت کے اثبات کے لئے صراحتاً نص کا تذکرہ نہیں کیا لیکن اس کے باوجود سقیفائی جلسہ کی کارگذاریوں کو مذموم قرار دیا۔

ایک اہل نظر و تاریخ کے لئے یہ بات واضح ہے کہ حضرت امیرؑ ناگہانی بیعت پر قطعاً راضی نہیں تھے۔ ابوبکر کے اقدام کو غصب سے تعبیر کیا۔ اس کا اظہار حضرت کے بے شمار کلمات نہج البلاغہ سے ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ روشنی خطبہ شقشقیہ سے پڑتی ہے جسمیں حضرت نے اپنی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار فرمایا ہے۔

بہر حال اُنھیں لوگوں کے بیان کے مطابق حیات حضرت زہراءؑ

سلام اللہ علیہا تک ابوبکر کی بیعت نہیں کی چونکہ وہ خود خلافت کے مستحق تھے ۔ یہ ظلم تھا جو حضرت کو ان کا حق نہیں دیا گیا۔

مروج الذہب کے بیان کے مطابق سقیفائی ڈرامہ کا دوسرا دن تھا جب لوگ ابوبکر کی بیعت کر چکے تھے حضرتؑ نے ابوبکر سے کہا:

"افسدت علینا امرنا ولم تستشر ولم ترع حقا"۔

تم نے ہمارے حق کو برباد کیا نہ مشورہ کیا نہ حق کی رعایت کی۔

یہ ارشاد حضرت کی ایک فریاد تھی جو آپ نے سقیفہ والوں کی خود رائیوں پر بلند کی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ وہ ان کے عمل سے راضی نہیں ہیں۔

حضرت علیؑ ان لوگوں میں نہیں تھے جو راہ خدا میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے ڈر جائیں یا دین کے مسئلے میں دو رُوی یا رواداری کا مظاہرہ فرمائیں۔

ابوبکر نے حضرت کا جو جواب دیا وہ خود حضرت کی حقانیت کی دلیل ہے۔ ابوبکر نے کہا:

بلیٰ! ولکن خشیت الفتنہ

آپ کا اعتراض و شکوہ حق بجانب ہے لیکن مجھے فتنہ و فساد کا خوف تھا۔

تاریخ نہیں بتاتی کہ حضرت نے ابوبکر کا کیا جواب دیا آپ کے

خیال میں کیا : ـــــــ

الف۔ حضرت، خلیفۂ اول کے جواب پر راضی ہو گئے ـــــ یا

ب۔ جواب دینا مناسب نہیں سمجھا ـــــ یا

ج۔ تاریخ نے آپ کے جواب کو محفوظ نہیں کیا۔ ؟

خود حضرت کا خطبہ اس سلسلے میں موجود ہے :

فلما قرعته بالحجة فی الملاء الحاضرین

هب کانه لا یدری ما یجیبنی به۔

جس وقت میں نے مجمع عام میں ابوبکر کی سرزنش کی اس سے جواب دیتے نہ بنا۔

بالفرض اگر حضرت نے پہلی بار ابوبکر کا جواب نہ دیا ہو لیکن پیہم واقعہ سقیفہ کی مذمت فرماتے رہے۔ خطبہ شقشقیہ میں ہے :

"خلافت کے غصب کئے جانے پر میں نے صبر کیا۔ مجھے اس وقت ایسی اذیت محسوس ہو رہی تھی جیسی آنکھ میں خاشاک اور گلے میں ہڈی پھنسنے کے وقت کسی کو محسوس ہوتی ہے میں دیکھ رہا تھا میری میراث لوٹی جا رہی تھی۔"

تاریخ صراحت سے بتاتی ہے کہ آپ نے بیعت نہیں کی۔ زمانہ آپ سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کے حق کو چھینا تھا حضرت انھیں ان کی حرکتوں پر ظالم سے تعبیر کرتے۔ نہج البلاغہ میں ہی یہ ارشادِ حضرت ہے :

"خدا کی قسم پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد آج تک لوگوں

نے مجھے پیہم میرے حق سے محروم کیا اور میرے ساتھ زیادتیاں کیں ـــــ" آج تک سے مراد یعنی خود حضرت کی خلافت تک۔

یہ ہے سقیفہ سے متعلق حضرت کے خیالات و نظریات، صرف خطبہ شقشقیہ کا مطالعہ حقائق کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن تاریخ کی یہ کوشش ہے کہ اس حقیقت پر پردہ ڈال دے چونکہ تاریخ کو یہ اعتراف ہے کہ حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا علیؑ کے ان خیالات کے بعد یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ وہ غلط ہیں لہٰذا ارباب تاریخ کی کوشش یہ رہی کہ صاحب حق علیؑ کی مرضی کے خلاف جو کچھ سقیفہ میں ہوا اس کی پردہ پوشی کریں ـــــ لیکن حق بلند ہے بلند کیا نہیں جاتا۔

تاریخ و سیر کے علاوہ بخاری و مسلم میں یہ حدیث ہے کہ ـــــ

"جب تک فاطمہؑ زندہ رہیں لوگوں کی نظر حضرت علیؑ پر جمی رہی۔ لیکن فاطمہؑ کی رحلت کے بعد جب ابوبکر کی بیعت کرلی تو لوگوں کی توجہ ہٹ گئی۔ فاطمہ بعد رسول چھ ماہ زندہ رہیں" ـــــ

اس سے قطع نظر کے حضرتؑ نے خلیفہ اوّل کی بیعت کی یا نہیں کی مسلم و بخاری کی اس حدیث سے اتنا تو واضح ہوگیا کہ چھ ماہ تک لوگ علی کو حق دار خلافت سمجھتے ہوئے ان کی طرف متوجہ رہے۔

خلفاء سے راضی نہ ہونے کی شہادت معاویہ کے خط سے ہوتی ہے

معاویہ نے حضرت پر کچھ الزام لگاتے ہوئے کہا کہ:

"تم نے خلفاء کے ساتھ ظلم و زیادتی کی، ان کے اقدام کو ناپسند سمجھا۔"

حضرت نے بعض باتوں کا اعتراف کر لیا اور بعض کی تردید فرمائی۔ حضرت فرماتے ہیں:

"تیرا یہ کہنا کہ میں نے ان پر ظلم و زیادتی کی یہ غلط ہے رہا یہ سوال کہ ہم نے ان کے اقدام کو سراہا نہیں، تو یہ صحیح ہے جس کے لئے میں کوئی معذرت نہیں کر سکتا۔"[1]

گویا حضرتؑ نے معاویہ کے جواب میں بھی واضح کر دیا کہ سقیفائی ٹولہ کے کرتوت سے وہ راضی نہیں تھے۔

کیا کریں؟

ہر دقیق نظر رکھنے والے پر یہ بات آشکار ہے کہ حضرت اپنے گزشتہ خیالات کی بنیاد پر چاہتے تھے کہ اپنا حق غاصبوں سے چھین لیں اس کی جھلکیاں آپ کے اقوال و افعال میں نظر آتی ہیں۔ اسی خطبہ شقشقیہ میں ہے:

---

[1] نہج البلاغہ ۳ ص ۴۰۹

"اس خدا کی قسم جس نے دانے میں نمود روئید گی بخشی اور ذی حیات کو پیدا کیا اگر یار و مددگار کی موجودگی کی وجہ سے حجت تمام نہ ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ستمگاروں کی پرخوری اور مظلوموں کی بھوک و پیاس پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں آج مہار خلافت اسی شتر خلافت کے کوہان پر پلٹا دیتا اور جو کام سقیفہ کے بعد رونما ہونے والی خلافت کے ساتھ کیا آج بھی وہی کرتا۔"

حضرت نے اس خطبہ میں ظاہر کر دیا کہ جس طرح پہلی بار اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔ آج بھی اسی طرح نظر انداز کر دیتا لیکن دونوں زمانے میں بہت بڑا فرق ہے۔

پہلی خلافت کے وقت بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتا تھا لیکن اب صورت حال اس جیسی نہیں ہے اب انکار کا موقع نہیں جس طرح پہلی خلافت کے وقت درد و کرب کی حالت میں اپنے حق سے درگذر کر گیا لیکن اب درگذر کا موقع نہیں۔

ایک اور موقعے پر حضرت فرماتے ہیں:

"اگر چالیس صاحب عزم و ارادہ مجھے مل جاتے تو میں اپنے حق کے لئے غاصبین سے جنگ کر دیتا۔"

یہی حضرت کے وہ ارشادات ہیں جس کو معاویہ نے خلفاء کیلئے

بغاوت سے تعبیر کرتے ہوئے آپ کو ایک خط میں لکھا:

فمہما نسیت فلا انسی قولک لابی سفیان
لما حرکلک و ہیجلک لوجدت اربعین
ذوی عزم منہم لنا ھضت القوم۔

میں سب کچھ بھول جاؤں گا لیکن تمہارا یہ قول نہیں بھولوں گا جو تم نے ابو سفیان کے جواب میں کہا تھا، جب وہ تم کو آمادۂ جنگ کر رہا تھا ــــ اگر چالیس صاحب عزم و ارادہ مجھے مل جاتے تو میں ان لوگوں سے جنگ کر لیتا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے معاویہ کے اس فقرہ کو رد نہیں فرمایا ــــ اگر ناصر و مددگار حضرت کے پاس ہوتے تو اس وقت کے مدینہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

تاریخ یعقوبی ہمارے دعوے کی شاہد ہے:

"حضرت علیؑ کے ارد گرد رہنے والوں نے یہ خیال کیا کہ چالیس صاحب عزم و ارادہ جس کی مولا کو ضرورت ہے وہ عدد پوری ہو چکی ہے لہٰذا حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان لوگوں سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

حضرت چونکہ حالات سے باخبر تھے لہٰذا امتحان کے لئے فرمایا کہ کل علی الصّباح سر منڈا کر میرے

پاس آنا جب دوسرا دن آیا تو صرف تین نفر تھے جو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔"

خود حضرت نے اپنی بے کسی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں سوچتا رہا آیا یک و تنہا ان سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہوں یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صبر کروں جس میں بچے بوڑھے ہو گئے اور بوڑھے فرتوت اور مومن موت تک رنج و اذیت دیکھتا رہا۔"

دوسرے خطبہ میں حضرت اپنی تنہائی کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

"جب نظر دوڑائی تو اپنے اہل بیت کے علاوہ کسی کو نہ پایا لہذا رک گیا۔"

حضرت عجیب دوراہے پر کھڑے تھے — یا اپنے اہل بیت کو شہید کرادیں یا حالات پر صبر و شکیبائی سے کام لیں۔

اہل بیت رسول کی شہادت سے اسلام کو جو خسارہ پہنچتا وہ ناقابل تلافی تھا۔ اہل بیت کی شہادت کے بعد صفحۂ ہستی عترت پیغمبر اسلامؐ سے خالی ہو جاتی اور ہدایت کے دو رکن قرآن و عترت میں سے ایک رکن منہدم ہو جاتا جب کہ مرسل اعظمؐ نے ہدایت کے لئے قرآن و عترت دونوں سے تمسک کو ضروری قرار دیا تھا۔

دوسری راہ حضرت کے سامنے یہ تھی کہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت پر عمل درآمد

نہ ہو پائے۔ چونکہ پیغمبر اسلامؐ ہی کا حکم تھا کہ آپ ان کے بعد امت کے امام اور مسلمانوں کے خلیفہ ہیں ان دو راہوں میں کون سی راہ اسلام کیلئے زیادہ مفید ہے ہمیں اس کی تعیین کا حق نہیں چونکہ امام وقت اپنی ذمہ داریوں سے خود باخبر ہے آیئے! دیکھیں امام وقت نے کس راہ کو اختیار کیا۔ واضح ہے کہ امام علیؑ نے نیرنگی زمانہ پر صبر کیا اور اپنے حق سے دست بردار ہو گئے اور غور و خوض کے بعد اسی نتیجہ تک پہنچے تھے کہ ناصر و مددگار کے نہ ہونے کی صورت میں صبر بہتر ہے۔

اگر کوئی تھوڑا تدبر و تفکر کرے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ صبر کیوں جنگ سے بہتر تھا اس لئے کہ جو حالات پیدا ہو چکے تھے اس سے یہ بات نمایاں ہو چکی تھی کہ حسد و عداوت کا ایک طوفان ہے جس کا رخ آپ کی طرف ہے۔ اگر اس وقت برسرپیکار ہوتے تو آپ کی شہادت رائیگاں جاتی مخالفین کو موقع مل جاتا کہ آپ کو معاذ اللہ، ایک دہشت گرد مرتد اور حاکم وقت کے خلاف خروج کرنے والے سے تعبیر کر کے ہمیشہ کے لئے تاریخ کے قبرستان میں دفن کر دیں۔

اس کا ثبوت موجود ہے امام نے اگرچہ صبر و تحمل سے کام لیا لیکن اس کے باوجود آپ کو ناسزا باتیں کہی گئیں۔ آپ کے حق کو چھینا گیا، یہاں تک کہ آج تک آپ کی شخصیت کا حقیقی رخ سامنے نہ آسکا۔

جس وقت آپ کے چچا عباس اور دوست نما منافق ابوسفیان نے آپ کی بیعت کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا:

"افلح من نهض بجناح او استسلم فاراح

کامیاب وہ ہے جو اٹھے تو پورے اختیار کے ساتھ اٹھے ورنہ کرسیٔ اقتدار کو دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔

حضرت نے پھر فرمایا:

مجتنی الثمرۃ بغیر وقت ایناعھا کالزارع بغیر ارضہ۔

پھلوں کو ان کے پکنے سے پہلے چننے والا ایسا ہے جیسے دوسروں کی زمین میں کاشت کرنے والا۔

ان پُر آشوب حالات میں تلوار علَم کرنے سے اسلام کو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچتا اور خود منصب و اقتدار کی ہوس و لالچ کا الزام بھی آتا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کو اسلام کا مفاد عزیز تھا وہ اسلام کی سلامتی کے لئے ہر قربانی و ایثار کے لئے تیار تھے۔

خود حضرت نے فرمایا:

"یہ (خلافت) ایک آلودہ پانی اور ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلو گیر ہو کر رہے گا۔"

اور اگر حکومت و اقتدار کے ذریعہ عدل و انصاف کو فروغ نہ مل رہا ہو تو یہ حکومت حضرت کی نگاہ میں آپ کی ٹوٹی ہوئی نعلین سے زیادہ بے قیمت تھی۔

یہی وہ نکات تھے جس کی وجہ سے عباس و ابوسفیان کے مطالبۂ بیعت کے باوجود بیعت کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ اصلاح قوم کی خاطر فرمایا:

"فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر اپنے کو نکال لے جاؤ تفرقہ و انتشار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو فخر و مباہات کے تاج اتار پھینکو۔"

شاید امام علیہ السلام نے یہ احساس کر لیا تھا کہ ابوسفیان یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابوبکر کی بیعت کر کے "قبیلہ تیم" کی حاکمیت کو تسلیم کرے چونکہ "تیم" قریش کا بہت چھوٹا قبیلہ تھا ابوبکر جس کی فرد تھے۔ چونکہ عباس و ابوسفیان کا ابوبکر کی بیعت سے گریز تعصب جاہلی اور قبیلہ کی وجہ سے تھا تو حضرت علیؑ نے نکتہ کی طرف معاویہ کے خط میں اشارہ فرمایا:

"مسلمان کے لئے مظلومیت ذلت کا سبب نہیں ہے بشرطیکہ عقیدہ مذہبی پختہ رکھتا ہو۔"[1]

جس وقت ابوبکر کو عباس کے نظریہ کی خبر ہوئی رات ہی رات میں ان سے ملاقات کی۔ بحث و تکرار کے بعد ابوبکر نے عباس اور ان کے لڑکے کو خلافت کی لالچ دیکر طرفدار بنا لیا۔

ابوسفیان کے لئے ابی الحدید کا بیان ہے کہ جب وہ مدینہ وارد ہوا

---

[1] ج ۱ ص ۳۰

تو اس کی آمد کی خبر سن کر عمر نے ابوبکر سے کہا کہ ابوسفیان آچکا ہے ہم لوگ اس کے شر سے محفوظ نہیں ہیں۔

ابوسفیان حیات مرسل اعظمؐ میں زکاۃ کی جمع آوری کیلئے مامور کیا گیا تھا۔ لہٰذا جو مال اس کے پاس تھا ابوبکر نے سارا کا سارا اس کو بخش دیا تاکہ اس کے شر سے امان ملی رہے۔

اگر بالفرض جنگ میں حضرت شہید نہ بھی ہوتے تو حضرت کا تلوار علم نہ کرنا عاقلانہ اقدام تھا چونکہ بلاشبہ ارباب سقیفہ کو تہہ تیغ کرنے کے بعد فتنہ و فساد عروج پر ہوتا اور مسلمانوں میں دو دھڑے بن جاتے۔ درآنحالیکہ اسلام کی جڑیں عربوں کے دلوں میں مضبوط نہیں ہوئی تھیں نہ ہی اسلام کو سرزمین عرب پر تسلط و استحکام ملا تھا۔

حضرت علی نے حنظل سے تلخ جام کو پینا گوارہ کرلیا، اپنے حق کو دوسروں کے حوالے کر دیا تو کیا علیؑ خائف و ہراساں تھے؟

نہیں قطعاً نہیں علیؑ وہی علیؑ تھے جن کی شجاعت مسلّم تھی، علیؑ کو خوف و ہراس اس کا تھا کہ تیزازہ مذہب بکھر کر رہ جائیگا اور ملت اسلامیہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

لہٰذا حضرتؑ نے اسلام کی حیات، مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق، بقاء اور مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے ظاہر بہ ظاہر حکومت وقت سے آشتی کرلی۔

نہج البلاغہ میں حضرتؑ نے اپنے خوف و ہراس کا تذکرہ ان الفاظ

میں کیا ہے :

"جب سے حق سے آشنا ہوا ہوں اس میں شک نہیں کیا۔
حضرت موسیٰ کو اپنا خوف نہیں تھا بلکہ نادانوں کے غلبہ
اور گمراہی کا ڈر تھا۔"

حضرت نے اپنے کو حضرت موسیٰ سے تشبیہ دی ہے لوگوں نے حضرت موسیٰ پر بزدلی کا الزام لگایا لیکن بشری جنبہ کے پیش نظر ڈرنے اور باطل کے غلبہ سے ڈرنے میں فرق ہے۔ لہٰذا یہاں حضرت کو دشمن کی عسکری طاقت سے خوف نہیں تھا بلکہ تلوار علم کر دینے میں مسلمانوں کے مستقبل کی تباہی کا خطرہ تھا۔

اسلام کو مولیٰ نے خون دل سے سینچا تھا لہٰذا اس اسلام کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار تھے ورنہ جس وقت ابو سفیان نے کہا ہے۔
"میں مدینہ کو آپ کی حمایت میں سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا ـــــ تو حضرتؑ نے جواب میں فرمایا :

"تیرا مقصد صرف فتنہ و فساد ہے تو ہمیشہ سے اسلام کا
بدخواہ رہا ہے۔ مجھے تیری نصرت و مدد نہیں چاہیے"۔

اگرچہ حضرت کو ناصر و مددگار کی ضرورت تھی ایسی صورت میں ابو سفیان نے مدد کی پیشکش کی لیکن حضرت نے نہایت صاف و واضح لفظوں میں مدد لینے سے انکار دیا۔ علیؑ اسلام کا سودا نہیں کر سکتے تھے انہوں نے اسلام کی بقاء کے لئے اپنا لہو دیا تھا۔ لہٰذا اسلام ہر شئی

سے زیادہ آپ کی نظر میں عزیز تھا اگرچہ دوسروں نے اس کی قدر و منزلت کو نہیں پہچانا اس کی بقاء کے لئے ہر طرح کے جتن کئے بڑی بڑی خطرناک گھاٹیوں سے اس کو بچایا تھا خود یہی ابوسفیان جس نے مدد کی پیشکش کی تھی جب ابوبکر سے رشوت مل گئی تو سارے سوار و پیادے ہوا ہوگئے۔

عقد الفرید اور نہج البلاغہ میں حضرت نے ابوسفیان کی دعوت نصرت کے رد کرنے کی وجہ کا تذکرہ معاویہ کے خط میں فرمایا ہے:

"میں نے اس لئے اس کی مدد قبول نہیں کی چونکہ لوگوں کے کافر ہونے کا خدشہ زیادہ تھا میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف نہیں چاہ رہا تھا۔"

کیوں کر جیئے

ساری تلخیوں اور روحی اذیتوں کے بعد حضرتؑ نے خلافت کو چھوڑ دیا اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کا خلفاء کے ساتھ طرز معاشرت کیسا رہا کیا عوام الناس کی طرح اپنے کو حکومت کا طرفدار بنالیا یا اسی حد میں میل جول رکھا جس کی اس وقت کی فضا مطالبہ کر رہی تھی،

اگرچہ قدیم وجدید مؤرخین نے اس رخ کو پیش کیا ہے کہ حضرت کا رویہ خلیفہ وقت اور نظام جدید سے نہایت مصالحانہ تھا حضرت قلب سے سقیفائی نظام کے طرفدار تھے، لیکن تحقیق مجھ کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس قدر جلد اس بات کو تسلیم کر لوں۔

تاریخ کہتی ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی لیکن بخاری مسلم اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شہادت کے بعد بیعت کر لی۔ دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ فاطمہ زہراؑ چھ ماہ زندہ رہیں، حیات زہراؑ میں حضرت علیؑ گھر سے نہیں نکلے نہ جمعہ و جماعت میں شریک ہوئے نہ کسی کی ہاں، نہیں میں حصہ لیا، نہ ہی آپ جنگ ارتداد وغیرہ میں شریک ہوئے۔

اور جب رات ہو جاتی تو فاطمہ زہراؑ اور حضرات حسنین علیہم السلام کے ساتھ انصار کے گھروں پر جاتے انہیں اپنی خلافت کی طرف بلاتے اور رسولؐ اللہ کی وصیت یاد دلاتے۔ حضرت کے اسی طریقہ کار کو معاویہ نے اپنے گذشتہ خط میں گناہ سے تعبیر کیا ہے۔

انصار کے گھروں میں جانے کا مقصد کیا یہ تھا کہ انہیں ابوبکر کی بیعت سے منحرف کریں؟ ہرگز نہیں —— چونکہ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ خلافت جب لوگوں نے چھین لی تو دست بردار ہو گیا۔ صبر کو جنگ پر بہتر پایا، ابوسفیان و عباس کی دعوت نصرت کو رد کر دیا — ایک طرف حضرت کا یہ انداز و ارشاد —— دوسری طرف راتوں کو انصار کے گھر جانا، ان دونوں باتوں میں ہم آہنگی نہیں ہے لہٰذا حضرت کے عمل میں کوئی اہم راز تھا۔

شاید وجہ یہ رہی ہو کہ حضرتؑ انصار پر واضح کرنا چاہتے رہے ہوں کہ انہوں نے ابوبکر کی بیعت جلدبازی میں کی، ان کا یہ اقدام حق کے خلاف

ہے۔ اس رخ کی طرف حضرتؑ کے کلام میں اشارہ ہے:

اللّٰھم انك تعلم انه لم یکن الذی کان منا منافسة فی سلطان ......

"معبود! تو جانتا ہے میں نے جو بھی کیا نہ مال و دولت کی لالچ سے کیا نہ حکومت کی ضد میں انجام دیا بلکہ میری منشاء تھی کہ تیرے دین کو اصلی حالت میں پلٹا دوں اور تیری زمین پر خیر و صلاح کو رواج دوں۔"

تاریخ کے گرد و پیش سے یہ واضح ہے کہ اتمام حجت اور اظہار حق کی خاطر آپ ہمیشہ اپنی جانشینی کا اعلان فرماتے رہے اور گوشہ نشینی کے زمانے میں جو اصحاب آپ کے اردگرد تھے انہیں دیکھ کر حکومت کو یہ احساس ہوتا کہیں ان کے خلاف سازش تو نہیں ہو رہی ہے لہٰذا افراد چھوڑے جاتے تاکہ یہ اجتماع نہ ہو سکے۔ لیکن شمع امامت کے پروانے پھر حلقہ بگوش ہو جاتے۔ میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں کہ:—

- ۔ حضرت کی آمد و رفت انصار اور مسلمانوں کے گھروں میں تھی۔
- ۔ جمعہ و جماعت میں شرکت نہیں فرماتے تھے۔
- ۔ اگرچہ آپ میں شعار مذہبی کے انجام دینے کا والہانہ جذبہ تھا کسی میں جرأت نہیں کہ جو احکام الٰہی کی انجام دہی سے متعلق آپ کے خلاف زبان کھول سکے۔

امام کی یہ روش صاف صاف لوگوں کو متنبہ کر رہی تھی کہ وہ موجود

حکومت سے راضی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ابوبکر نے اپنے خطبہ میں اس کی طرف اشارہ کیا:

"کمزوروں سے مدد لے رہے ہیں، عورتوں سے نصرت کے خواہاں ہیں، مثلاً ام طحال جس کے خاندان کے اکثر افراد گمراہ پسند ہیں اگر میں بولوں تو بہت سی چیزوں کو برملا کر دوں۔ لیکن اس وقت تک چپ ہوں جب تک مجھ سے سروکار نہ رکھیں۔"

ابوبکر کے اس بیان میں خوف و ہراس بھی ہے اور افشار راز کی دھمکی بھی، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آج تک کوئی اس راز سے باخبر ہوا ہو جس کے فاش کرنے کی خلیفہ نے دھمکی دی تھی اور آشکار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ خیالات تو بہت ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن کسی نقطہ پر ٹھہرتے نہیں بہرحال ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے حیات سیدۂ زہرا سلام اللہ علیہا میں ابوبکر سے قطع روابط رکھا اور اپنی جانشینی کا اعلان فرماتے رہے۔

حضرت امیرالمومنین کی نظر میں فاطمہ زہراءؑ کی مرتبت و منزلت تھی۔ شہزادی نے بھی حضرت امیرؑ کے دوش بدوش مسئلۂ خلافت میں جہاد عظیم انجام دیا ہے۔ حضرت زہراءؑ کی کوششوں نے امام وقت کو پہچنوانے میں بہت زیادہ نمایاں رول ادا کیا ہے۔ دربار خلافت میں فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے خطبے کی گھن گرج آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شہادت حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے بعد امیرالمؤمنین اور آپ کے اصحاب نے حکومت وقت سے ظاہر بہ ظاہر آشتی کر لی تاکہ نظام اسلام کو کوئی صدمہ نہ پہنچے ۔ امام علیہ السلام نے اہل بصرہ کے خط میں اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

" فامسکت یدی حتی رأیت راجعة الناس قد رجعت عن الاسلام یدعون الی محق دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ۔"

" میں نے قطع روابط کر لیا ۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ کٹر قسم کے افراد اسلام کے خلاف سرگرم عمل ہیں تاکہ دین محمدیؐ کو مٹا دیں ۔ اس وقت مجھے خوف ہوا کہ اگر اب میدان میں نہیں آتا ہوں اور اسلام و مسلمان کی دست گیری نہیں کرتا ہوں تو عظیم شگاف اور ویرانی حصار اسلام میں رونما ہو جائے گی جو میرے لئے خلافت کے چھن جانے سے زیادہ تکلیف دہ تھی ۔

حضرت کی اسلام دوستی ہی تھی کہ اپنے حق کو نظر انداز کر دیا اور وقت ضرورت افراد حکومت کو خطرات سے بچاتے رہے ورنہ حضرت نے حکومت کی طرف سے لڑی جانے والی جنگوں یا محاذوں میں حصہ نہیں لیا ۔

وہ علیؑ جس نے بیس سال تک راہ اسلام میں دھواں دھار جنگیں کی ہوں ، جس کی تلوار کی زبان نے کفار کا خون خوب دل کھول کر

جاتا تھا۔ کوئی جنگ نہیں جس میں علیؑ کے جوہر جنگ دنیا نے نہ دیکھے ہوں، ہر جنگ میں عَلَمِ اسلام آپ کے سپرد رہا، بڑے سے بڑے سورماؤں کو خاک چٹوا دی ــــ آیا وہ علیؑ خانہ نشیں ہو جائے جس کی تلوار نے اسلام کو اونچا کیا، کیا وہ علی گوشہ نشین ہو جائے، منافقوں نے جس کے خلاف محاذ بنا رکھا ہو، کیا علی نے واجبات کو نظر انداز کر دیا کیا علیؑ نے جہاد سے کنارہ کشی کر لی؟

ایسا نہیں ہے جیسا ہم نے سوچا ہے، علی اپنی طرف سے مفادِ اسلام کے لئے خلفاء سے میل جول رکھتے تھے، لیکن خود خلفاء نے حضرت علیؑ کو اپنی پالیسیوں کی وجہ سے دعوت نہیں دی اور جب حضرت کو بلایا نہیں گیا تو حضرت نے بھی اپنے سے کوئی پیش قدمی نہیں کی.

نہ صرف حضرت علیؑ بلکہ کسی ایک فردِ بنی ہاشم کو زمانہ خلفائے ثلاثہ میں فرماندۂ لشکر قرار نہیں دیا گیا۔ اس کی شہادت ابن عباس اور عمر بن خطاب کے مکالمہ میں موجود[1] ہے، جس وقت عمر نے ابن عباس کو حمص روانہ کرنا چاہا ہے۔

عمر ــــ ابن عباس! میرے دل میں تمہارے لئے کچھ خیالات ہیں اگرچہ تم ایسے نہیں ہو ــ کہیں ایسا نہ ہو تم کو بھیجوں اور تم، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رہے ہو، چونکہ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۴۲۷

آنحضرتؐ نے اوروں کو کام سونپے ہیں لیکن تم لوگوں کے سپرد کچھ نہیں کیا۔

ابن عباس ــــ آخر ایسا کیوں ہوا ؟

عمر ــــ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کیوں رسولؐ خدا نے یہ کیا۔ جب کہ تم لوگ اس کے اہل تھے، ہو سکتا ہے بے لطفی کی ہو یا ممکن ہے اس وجہ سے نہیں دیا، کہیں تم لوگ ان کی قرابت کی وجہ سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ اور بعد میں تم لوگوں کو غلطیوں کی سزا دینی پڑے۔

جس وقت ابن عباس نے عمر کے ان خیالات کو معلوم کیا تو حمص جانے سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ میں تو تمہارے لئے کام کروں اور اس کے باوجود تمہاری آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکتا رہوں۔

عمر کے اس مکالمہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خلفائے ثلاثہ نے بنی ہاشم کو اس خوف سے عہدے نہیں دیئے کہیں بنی ہاشم ان عہدوں کے ذریعہ لوگوں کو اپنی طرف جذب نہ کرنے لگیں۔

ممکن ہے کوئی یہ جواب دے کہ علی اور بنی ہاشم کو منصب عہدے نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ حضرتؑ کا انداز خلفاء کے ساتھ ایسا تھا جس سے انہیں خوف تھا کہ کہیں علی لوگوں میں اپنی امامت کو نہ منوالیں اور خلافت خلفاء کے ہاتھ سے نکل جائے۔

جبکہ امیر المومنینؑ خلفاء کی طرف سے ملنے والی ذمہ داریوں کو خود

قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

عثمان نے عمر سے کہا: "جنگ فارس" پر کسی ایسے کو بھیجو جس کے پاس تجربہ جنگی ہو۔

عمر: ایسا کون ہے؟

عثمان: علی ابن ابی طالبؑ۔

عمر: ٹھیک ہے تم ان سے ملو اور اس کا تذکرہ کرو۔ کیا تمہارے خیال میں وہ قبول کریں گے؟

عثمان نے حضرت سے ملاقات کی اور حالات بتائے۔ لیکن حضرت نے انکار کر دیا۔

اس مکالمہ سے آپ خود نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عمر کو پہلے سے شک تھا کہ حضرت قبول نہیں کریں گے اور ہوا بھی یہی۔

یہ ساری باتیں اس کا ثبوت ہیں کہ بعد از فاطمہ زہراؑ اگرچہ ظاہری طور سے خلفائے ثلاثہ سے آشتی ہو گئی تھی لیکن اسی حد تک جس کی اسلام اجازت دے رہا تھا۔

عصر خلفاء میں علی بن ابی طالبؑ نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ کسی واقعے میں شریک ہوئے گویا مسلمانوں کے درمیان تھے ہی نہیں۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ اس وقت دکھائی دیتے جب ان سے کوئی مشورہ لیا جاتا یا حکومت کو کوئی مشکل در پیش ہوتی۔

عمر کے اس قول کی گونج باقی ہے:

"اگر علی نہ ہوتے عمر ہلاک ہو جاتے"

"وہ دن نہ آئے کہ میرے سامنے کوئی مشکل ہو اور علیؑ کی مشکل کشائی نہ ہو"

خلفاء نے حضرت امیرؑ سے جو مشورے کئے یا احکام معلوم کئے اگر اس کو پیش کرنے لگوں تو وہ خود مستقل ایک کتاب ہے۔ لہ الحمد۔

حسین مہدی حسینی۔ شعبان سنہ ۱۴۱۶ھ

حضرت علیؑ کے اثبات کے لئے معاون و مددگار ہے ۔ کیونکہ حضرت علیؑ کی فضیلت میں بے شمار نصوں کو یہ کہکر رد کر دیا جائے کہ وہ خلافت کی تعین کے لئے نہیں تھیں بلکہ آپ کی مدح و ثنا میں آئی تھیں اور سقیفائی اجلاس خلوص نیت سے شرعی ضابطہ سے وجود میں آیا ، خلافت کو حضرت علیؑ سے چھیننا مقصود نہیں تھا ۔ اس فرض کے بعد بھی حضرت علیؑ کو آنحضرت سے بے پناہ نسبتیں تھیں ـــ علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی ـــ تو ان فضائل کے پیش نظر بھی آپ کو اور آپ کے اہلبیت کو سقیفائی جلسہ میں آگے آگے رکھنا چاہئے تھا ۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہ آپ کو دعوت دی نہ مشورہ لیا گیا بلکہ شروع سے آخر تک یہ کوشش رہی کہ آپ کو اور بنی ہاشم کو اس اجتماع کی خبر نہ ہونے پائے ۔ ایسا لگتا ہے یہ حضرات یا مدینہ میں نہیں تھے یا ان کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی ۔

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷ـ۳۷۱۸۵

قم جمہوری اسلامی ایران

ٹیلی فون نمبر ۴۴۷۱۴۷